AUGUST
2021

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

Use Mask
Stay Safe

نغماتِ نور
گلستانِ حمد و نعت
نوازش علی شیخ

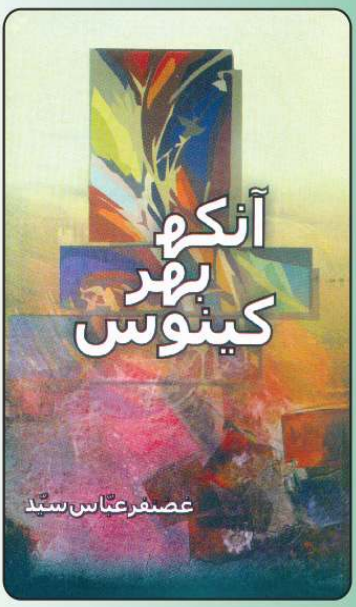

آنکھ بھر کینوس
غضنفر عبّاس سیّد

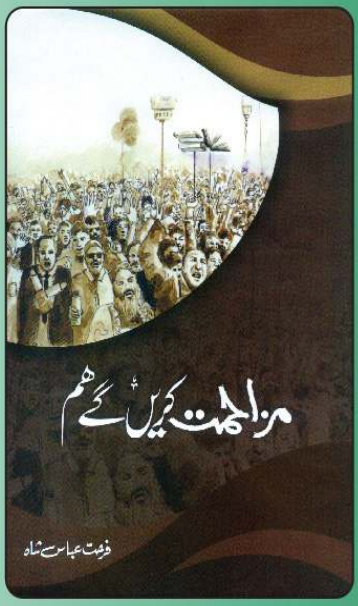

مزاحمت کریں گے ہم
فرحت عباس شاہ

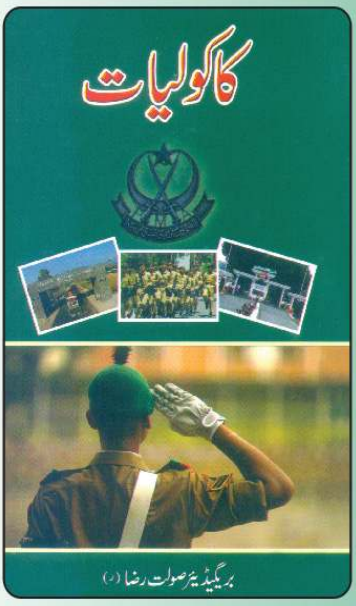

کاکولیات
بریگیڈیئر صولت رضا (ر)

غزل

شُند خوئی پہ طنز کر جاؤں
بن کے خوشبو ، ہوا کے گھر جاؤں
دشمنِ جاں نفس نفس میرا
دُھول کا پھول ہوں ، کدھر جاؤں
تو بھلائے تو کیا بھلائے مجھے
نشہ ہوں کس طرح اُتر جاؤں
خود اُلجھتا ہوں ، خود سلجھتا ہوں
کچھ نکھر جاؤں ، کچھ سنور جاؤں
جسم اور عشق کے حوالے سے
میں تری روح میں اُتر جاؤں
بت کو دیکھا تو بت ہوا خالد
جی میں تھا ، دیکھ کر گزر جاؤں

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جسد تراب کا شذریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - اگست 2021 - شمارہ نمبر: 8

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ آزادی مبارک
قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے زریک لیڈ ملی پرنٹرز 16 کلومیٹر روڈ نزد اطہر شہید روڈ ملتان روڈ، لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر	7 تا 8
2	نعت	آصف ثاقب، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر گلزار بخاری، اکرم ناصر، عقیل رحمانی، سید فرخ رضا ترمذی سرور حسین نقشبندی، احمد محسود، ارشاد نیازی	9 تا 18
3	سلام	حامد یزدانی	19
4	مرثیہ	عقیل رحمانی	20 تا 21
5	عقیدت	سرور حسین نقشبندی	22
6	حمدیہ قطعات	خاور اعجاز	23
7	ماہیے	خاور اعجاز	24
8	ہائیکو	خالق آرزو	25
9	تہذیب قرآں کتاب، مشاہدہ	سیدہ آیت گیلانی	26 تا 32
10	افسانے	فرحت پروین، آشا تھر کنول، فرخندہ شمیم، آغا گل ثمینہ سید، نوین روما، نور کمال شاہ	33 تا 67
11	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	68 تا 77
12	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی اعجاز کنور راجہ، جمیل یوسف، نسیم سحر، گلزار بخاری	78 تا 147

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
12	غزلیں	صفدر صدیق رضی، خاور اعجاز، راحت سرحدی، سید قاسم جلال ممتاز راشد لاہوری، فرخندہ شمیم، شوکت محمود شوکت، منفعت عباس رضوی اقبال سروبہ، تابش نقوی، اکرم ناصر، شاہنواز زیدی، شبہ طراز احمد جلیل، رضا اللہ حیدر، آنسہ تنویر، طلعت شبیر، افتخار شاہد بشیر احمد حبیب، عقیل رحمانی، ہمایوں پرویز شاہد، سید ضیا حسین طاہر ناصر علی، واجد امیر، انصر حسن، عاطف جاوید عاطف احمد سجاد بابر، محمد حماد، ارشد محمود ارشد، انصر رشید انصر شہزاد احمد شاذ، جواد احمد راسخ، ریاض رومانی، ظہور چوہان اشرف کمال، محمد نوید مرزا، شاہد ماکلی، شہزاد احمد شیخ، حسنین سحر علی حسین عابدی، زعیم رشید، صغیر احمد صغیر، عزم الحسنین عزمی عمر قیاز قائل، صائمہ اسحاق، ریاض ندیم نیازی، لبنیٰ صفدر وسیم جبران، اکرم جاذب، اژدر شیرازی، شہاب اللہ شہاب نوید سروش، سرور فرحان، آصف خیال، ذکی طارق، سہیل یار اویس راجا، سید الطاف بخاری، انجم عثمان، ارسلان ساحل عاصم اعجاز، احمد محسود، سید فرخ رضا ترمذی، فائق ترابی	78 تا 147
13	مائیکرو فکشن	عمار نعیمی	148
14	کتب بینی	خواجہ محمد زکریا، امجد اسلام امجد، ساجد علی امیر، نسیم سحر غافر شہزاد، عرفان صدیقی	149 تا 169
15	شاعرِ امروز	محمد عامر، احسن سلیمان [شاہد ماکلی]	170 تا 172
16	انشائیہ	اقبال خان یوسف زئی	173 تا 177
17	مضامین	فتح محمد ملک، اسلام عظمی، حامد یزدانی، نثار ترابی عامر رضوی، فرحت عباس شاہ، زاہد حسن، اعجاز روشن	178 تا 216
18	نظمیں	خالد احمد، امجد اسلام امجد، جلیس عالی، جمیل یوسف، شاہنواز زیدی فرحت پروین، خاور اعجاز، فرخندہ شمیم، طالب انصاری، شوکت محمود شوکت طاہر ناصر علی، نائیلہ راٹھور، طلعت شبیر، جمیل احمد عدیل امجد بابر، شازیہ مفتی، آفتاب محمود شمس، منصف ہاشمی، فرحانہ عنبر	217 تا 235
19	خطوط	آصف ثاقب، اشرف کمال، آفتاب احمد ملک، طالب انصاری، رانا محمد شاہد	236 تا 241

حمد

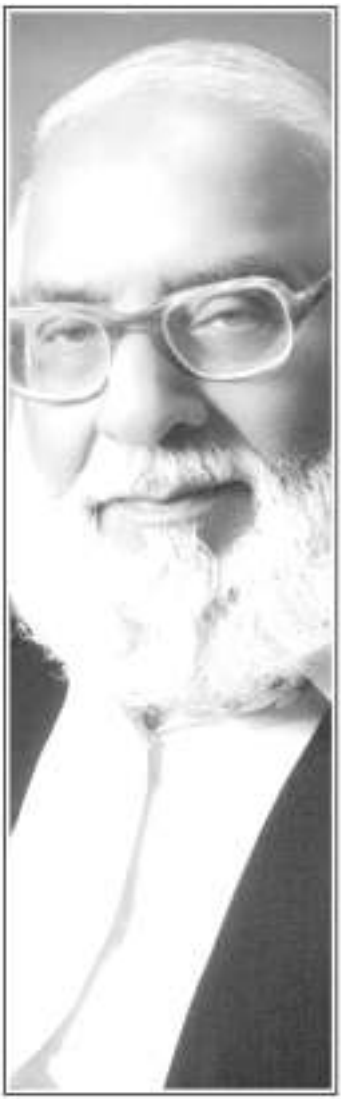

رب کریم! تیری عنایت ہے بے بہا
بے خانماں کو گھر جو دیا تو نے خوش نما

بے مثل کیسا حقِ رفاقت ہوا ادا
دیکھے نہ مصطفیٰؐ کہیں تجھ سے کبھی جدا

ہریالیوں نے روحِ جہاں کو سجا دیا
شاداب تیرا گھر ملا ، گنبد ملا ہرا

دکھلائی تو نے راہ جو ہے راہِ مستقیم
سمجھا دیا کہ کام نہ ہرگز ہو ناروا

بے رہروی کی راہ میں دیوار کھینچ دی
پورا ہوا چراغِ ہدایت کا مدعا

تو چاہے کائنات اندھیروں میں جا گھرے
تیرا کرم ہے تو نے اندھیروں کو دی ضیا

عہدِ ستم میں غیرتِ ایماں خطر میں تھی
ہے تیرا فیض تو نے مدینہ بسا دیا

غیظ و غضب سے تیرے ہیں کفار دم بخود
شرکِ جلی خفی کو جہاں سے مٹا دیا

میں ہوں ریاضؔ اس کی خدائی کا معترف
میرا سرِ نیاز ہے سجدے میں جا گرا

سید ریاض حسین زیدی

حمد

جو بھی لکھتا ہوں سخن پارۂ حمد
لب پہ آ جاتا ہے اِک نعرۂ حمد

گویا ہو جاتا ہے قرآں گویا !
جو بھی پڑھتا ہوں مَیں سیپارۂ حمد

ہفت افلاک سے بھی بالا ہے
کیا کہوں رفعتِ مینارۂ حمد !

حمدِ باری کا مَیں جو حرف لکھوں
وہی بن جاتا ہے شہ پارۂ حمد

پیش منظر ہوں کہ پس منظر ہوں
دیدنی سب میں ہے نظارۂ حمد

دے گیا حمد کی سوغات نسیم
مہرباں ہو گیا ہر کارۂ حمد

نسیمِ سحر

نعتؐ

مری اشکوں بھری راتیں محمدؐ کے لیے ہیں
جگر کی درد سوغاتیں محمدؐ کے لیے ہیں

مرے ہر لفظ میں عشقِ نبیؐ کی تحفگی ہے
سبھی اشعار اور باتیں محمدؐ کے لیے ہیں

خیالوں میں مدینہ ہے وہاں کے واقعے سب
مری نعتیں مناجاتیں محمدؐ کے لیے ہیں

انھیؐ کی یاد میں میرے نگر میں روشنی ہے
وظیفے اور خیراتیں محمدؐ کے لیے ہیں

وہاں دل کا نگینہ جب محمدؐ نام کا ہے
یہاں آنکھوں کی برساتیں محمدؐ کے لیے ہیں

درودِ پاک سے ثاقب فلک سے نور برسے
یہ ساون اور برساتیں محمدؐ کے لیے ہیں

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زَمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام

نعتؐ

خیرالوریٰؐ کے فیض سے ہم کو ہوا عطا
ورثہ کمال صدق و صفا آئینہ بنا

تزئینِ ہست و بود کے موجب حضورؐ ہیں
جس سے حیاتِ دہر کا نقشہ بدل گیا

اسمِ گرامی آپؐ کا سن کر جو شاد ہو
قلبِ سلیم کا اسے تحفہ عجب ملا

ظلمت کدوں میں کیسی ضیا پھوٹنے لگی
خفتہ نصیب ذرہ بھی یک دم چمک اٹھا

اعجاز ہے درود کا ہاں اس کے ورد کا
جو ڈولتا سفینہ تھا، ساحل پہ آ لگا

پس ماندگی میں جو کہ تھا اپنی مثال آپ
انؐ کی نگاہِ لطف سے وہ کیا سے کیا ہوا

ہو تذکرہ بس آپؐ ہی کا ہر محاذ پر
تاریکیوں کو کر کے رہے گا یہی فنا

بس نسبتِ حضورؐ مجھے سازگار ہے
جس نے مجھے سنبھال لیا ، حوصلہ دیا

میرا ریاضِ نعت میرے کام آگیا
دستِ کرم حضورؐ کا مجھ پہ سدا رہا

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

نسیمِ سحر

اللہ کی برکت کی کیا شان مدینے میں !
اِک نُور کا عالم ہے ہر آن مدینے میں

حاضر تو ہوں مکّے میں، اور دھیان مدینے میں
ہے جسم یہاں میرا، اور جان مدینے میں

طیبہ میں عطا ہو گا آرام وسکوں کتنا
دیکھو ذرا تم رہ کر مہمان مدینے میں

کچھ نعتیں مَیں پنڈی میں کیسے بھلا لکھ پاتا؟
ہونا تھا مکمل جب دیوان مدینے میں

سانسیں مری باقی ہیں وہ جب بھی مکمل ہوں
بس اتنی تمنا ہے دوں جان مدینے میں

میں اُنؐ کے بُلاوے پر حاضر ہوں جو طیبہ میں
روکے گا مجھے کیسے دربان مدینے میں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چہرہ تمام رنگ تھا ، پیکر کِرن تمام
کجلا کے رہ گئے مَہ و پروین تن تمام

نعتؐ

سخن درماندہ ہے اظہار کو عنواں نہیں ملتا
کوئی بھی لفظ ان کی شان کے شایاں نہیں ملتا

اُسی دارِ شفا سے لوٹتے ہیں کامراں ہو کر
جنھیں چارہ گرانِ عصر سے درماں نہیں ملتا

ستارہ سعد رہ سکتا نہیں اُن سے جدا ہو کر
انھیں کھو کر صدف کو گوہرِ تاباں نہیں ملتا

بڑھے جب کوئی اُن کے کارواں کو چھوڑ کر آگے
مسافت کے لیے اُس کو سر و ساماں نہیں ملتا

گلزار بخاری

کہیں خلقِ جہاں آرا و عالمگیر سے ہٹ کر
کسی کو اعتبارِ عظمتِ انساں نہیں ملتا

بہت ملتے ہیں جن کی رہبری محدود ہوتی ہے
کسی قریے میں ان سا ہادیِ دوراں نہیں ملتا

ثنا کے واسطے حرف و بیاں تو مل بھی جاتے ہیں
مگر گلزار کو پیرایہ قرآں نہیں ملتا

نعتؐ

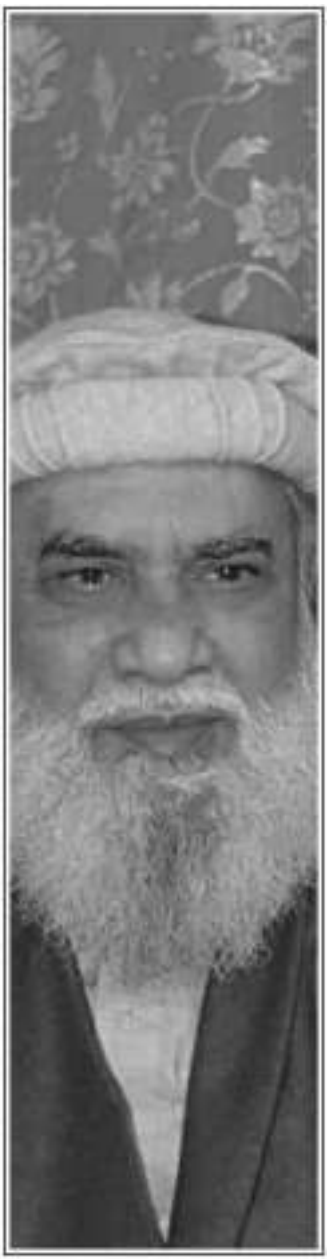

سارے نبیوں، سب رسولوں، ہر ولی کا راستہ
لاالٰہ کا راستہ ، میرے نبیؐ کا راستہ

ہم نے اپنایا، نہ اپنائیں گے، وعدہ آپ سے
آپ کے رستے سے ہٹ کر، اب کسی کا راستہ

اس سے ہٹ کر جتنے رستے ہیں، وہ ہیں سارے غلط
سوئے جنت جا رہا ہے، آپ ہی کا راستہ

ہاں وہی بھٹکا ہے، اپنایا ہے جس نے بھی یہاں
اپنی من مرضی کا، دل چاہے کا، جی کا راستہ

میں کہ ہوں بھولا ہوا، گم گشتہ رہ، بھٹکا ہوا
ہاں مگر بھولا نہیں تیری گلی کا راستہ

ہم خدا سے مانگتے ہیں جو صراط مستقیم
ہے وہی تو راستہ ، اکرمؐ نبیؐ کا راستہ

اکرم ناصر

نعتؐ

نام آقاؐ کا دُکھ مٹاتا ہے
ہر مصیبت میں کام آتا ہے

صدقِ دل سے درود جب بھی پڑھیں
دل مدینہ ہمیں دکھاتا ہے

لَو اُٹھاتی ہے سر چراغوں میں
نعت جب بھی کوئی سناتا ہے

اپنی اُمت کی مغفرت کا غم
سارے غم آپؐ کو بُھلاتا ہے

بعد اُنؐ کے نبی نہیں کوئی
صاف قرآن یہ بتاتا ہے

جب تصور میں آپؐ آتے ہیں
دل بے نور جگمگاتا ہے

اُنؐ کی رحمت کی بھیک ہے اتنی
کاسۂ دل چھلکتا جاتا ہے

اُس پہ جنت بھی رشک کرتی ہے
لَو مدینے سے جو لگاتا ہے

آنے والوں کی حاضری پہ عقیل
گُنبدِ سبز مسکراتا ہے

عقیل رحمانی

نعتؐ

شہرِ سرکارِ دوعالم کی فضا کیف میں ہے
ہو کے مَس گنبدِ خضریٰ سے ہوا کیف میں ہے

عشقِ سرور مرے سینے میں، لبوں پر ہے دعا
وجد میں دل ہے مرا، حرف دعا کیف میں ہے

جس طرف دیکھیے چھائی ہے گھٹا رحمت کی
اس لیے شہرِ مدینہ کی ہوا کیف میں ہے

درِ زہرا سے کبھی کوئی نہ پلٹا مایوس
غور سے دیکھیے ہر ایک گدا کیف میں ہے

نعت جو میں نے پڑھی روضۂ اطہر پہ رضا
ذکرِ سرور سے مدینہ کی فضا کیف میں ہے

سید فرخ رضا ترمذی

انتخاب

منہ دیکھتے ہی رہ گئے جادو بیاں سبھی
لب گنگ ہو کے رہ گئے معجز سخن تمام

- خالد احمد -

نعمان منظور

نعتؐ

وہ خدا آشنا نہیں ہوتا
جو بشر آپؐ کا نہیں ہوتا

کیا خبر اس کو دلکشی کیا ہے
جو مدینے گیا نہیں ہوتا

سبز گنبد سے جو کشید نہ ہو
رنگ وہ دیرپا نہیں ہوتا

سبز کھڑکی کہیں سے کھلتی ہے
جب کوئی راستہ نہیں ہوتا

خاک اڑتی مری زمانے میں
میں اگر آپؐ کا نہیں ہوتا

اس کو شاہی کے ڈھب نہیں آتے
جو بھی اُنؐ کا گدا نہیں ہوتا

جب درودوں کے تار چھڑ جائیں
پھر کوئی فاصلہ نہیں ہوتا

سیرتِ شہؐ سے لو لگائے بغیر
طے کوئی مرحلہ نہیں ہوتا

یہ عنایت ازل سے تھی سرورؔ
کیسے مدحت سرا نہیں ہوتا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

جب عطا مجھ کو نعت ہوتی ہے
معتبر میری ذات ہوتی ہے

نعت جو لکھتا ہوں تو لگتا ہے
میری آقاؐ سے بات ہوتی ہے

اسمِ احمد لیا اندھیرے میں
یوں اندھیرے کو مات ہوتی ہے

نعت کے یوں بہت تقاضے ہیں
لازمی احتیاط ہوتی ہے

سبز گنبد پہ ہے نظر احمد
خوب رو کائنات ہوتی ہے

احمد محسود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعتؐ

اس دل کو کہاں موت کہاں خوف فنا ہو
جس دل کا مقدر ترا نقشِ کفِ پا ہو

پلکوں پہ تریؐ دید کا امکان سجا ہو
اور لب پہ فقط ایک صدا صلی علی ہو

اتریں مرے آنگن میں بھی اب سبز پرندے
طیبہ کی ہواؤں سے مرا پیڑ ہرا ہو

اس پیکرِ صد ناز کو کہتے ہیں محمدؐ
جس پیکرِ صد ناز میں خود آپ خدا ہو

ہاتھوں میں لیے آئیں گے کشکول فرشتے
خیرات جو زہراؑ ترے باباؐ سے عطا ہو

کس طرح کوئی روتے ہوئے دل کو سنبھالے
کس طرح کوئی آپؐ کی چوکھٹ سے جدا ہو

ارشاد اسے کیسے بجھائیں گی ہوائیں
سرکارؐ کی رحمت سے منور جو دیا ہو

ارشاد نیازی

سلام

سرِ دوام یہ تحریر ہے، نہیں ہے کیا؟
غمِ حُسین ابد گیر ہے، نہیں ہے کیا؟

کہ زخم زخم اِسی روشنی سے چمکے گا
کہ بُوند بُوند میں تنویر ہے، نہیں ہے کیا؟

ترازُو پیاس میں اِک تیر تھا، نہیں تھا کیا؟
ترازُو پیاس میں اِک تیر ہے، نہیں ہے کیا؟

جہاں جہاں بھی رِدا ہے عَلَم بناتی ہُوئی
وہاں وہاں مِرا شبیر ہے، نہیں ہے کیا؟

خراجِ اشک ادا خامشی سے کرتے ہیں
کہ آہ ضبط بھی تشہیر ہے، نہیں ہے کیا؟

کہیں سے پھر کوئی رنگِ حسین ابنِ علی!
جہاں کی پھر وہی تصویر ہے، نہیں ہے کیا؟

یہ حُبِّ آلِ محمد کا فیض ہے، حامد
کہ تیرے شعر میں تاثیر ہے، نہیں ہے کیا؟

حامد یزدانی

مرثیہ

کرنوں کو جیسے ڈھانپ دے بڑھ کر شبِ سیاہ
صحرا سے اب شباب کے گلشن میں آیئے

سورج کے منہ پہ پڑ گئی یوں موت کی ردا
ہر ہر لڑی میں خون کی بوندیں سجایئے

شعلوں کا روپ دھار کے چلنے لگی ہوا
زخموں کے پھول پھول سے سہرا بنایئے

صحرا کی ریگ بن گئی دامن تنور کا
بڑھ بڑھ کے آج تیغ سے سینے ملایئے

جھونکے ہوا سے آنے لگے خوں کی باس کے
دیکھا تو رُخ سے موت کے سرخی اتر گئی

کوثر کے وارثوں پہ بھی پہرے تھے پیاس کے
قاسمؑ کے واسطے بھی تیروں کی سیج تھی

خرؑ اطلس و حریر کے رنگِ جمیل سے
لہرا رہا ہے نور کی طاقت کا وہ علم

سمجھا بلا کی ریگ کو بہتر شنیل سے
کونین میں سحر کی قیادت کا وہ علم

اک سانس کی بھی بھیک نہ مانگی بخیل سے
نرغے میں دشمنوں کے صداقت کا وہ علم

ٹکرا گیا ہے موت کی اونچی فصیل سے
جنت کے وارثوں کی امامت کا وہ علم

دہلیزِ غم کا تیرے کرم سے وقار ہے
جس کو عدو نہ کاٹ کے بازو جھکا سکے

اب بھی گلوں میں تیرے لہو سے نکھار ہے
تھامے ہوئے تھا حوصلہ عباسؑ کا اُسے

اک طفلِ شیر خوار دو عالم پہ چھا گیا
تازہ لہو سے قصرِ صداقت سجا گیا
ظالم کا تیر پیاس کی شدت بجھا گیا
اصغرؑ ہمک کے موت کے جھولے میں آ گیا

نازاں ہے جس پہ صبر و قناعت وہی حسینؑ
جس پر ہوئی ہے ختم عبادت وہی حسینؑ
نیزے پہ جس نے کی ہے تلاوت وہی حسینؑ
ہے جس کے سر پہ تاجِ شجاعت وہی حسینؑ

آہِ رباب سن کے فضا پاش پاش تھی
ہاتھوں پہ شہہؑ کے ننھے مجاہد کی لاش تھی

جس نے سرِ غرور کو نیچا دکھا دیا
پائندہ باد پرچمِ خونی حسینؑ کا

یہ کس نے موڑ دی ہے کلائی ممات کی
پتھرا گئی ہیں کس لیے آنکھیں حیات کی
ڈوبی ہے نبض کس کے لیے کائنات کی
کیوں رو رہی ہیں آج بھی لہریں فرات کی

صحرا کو، کون خون سے گُل رنگ کر گیا
پھوپھی پکارتی تھی کہ اکبرؑ کدھر گیا

نوحہ ہوا پہ لکھ گئیں کرنوں کی انگلیاں
گونجی فضا میں چارسُو سورج کی سسکیاں
اب تک تمھاری یاد میں روتی ہے کہکشاں
اشکوں سے پُر ہے دیکھ لے تاروں کا کارواں

کرب و بلا کی ریگ ہے اب بھی لہو لہو
غم میں مرے حسینؑ کے ماتم ہے چار سُو

عقیل رحمانی

ذکرِ اِلّا اللہ

جان و دل کی بہار اِلّا اللہ
روح کو دے قرار اِلّا اللہ

ایک جلوہ دکھائی دے گا بس
جب ہوا آشکار اِلّا اللہ

ورد کرتا ہے غور سے سُن لے
سانس کا تار تار اِلّا اللہ

خوف و وحشت سے ماورا ہو جا
صرف کہہ ایک بار اِلّا اللہ

چشمۂ خیر لاالہ کا ورد
برکتوں کا حصار اِلّا اللہ

عاجزی کا عروج ہے اس میں
بندگی کا وقار اِلّا اللہ

وقت گریہ یہی وظیفہ کر
دیدۂ اشکبار اِلّا اللہ

ایسے دل میں اتر زمانے کے
دل میں سرورؔ اُتار اِلّا اللہ

سرور حسین نقشبندی

حمدیہ قطعات

سارا گھر جب خُدا کا گھوم لِیا
اُس کی اِک اِک عطا پہ جھوم لِیا
اُس نے مانگا ثبوتِ رسمِ وفا
مَیں نے اَسود کو جا کے چوم لِیا

ہماری دعاؤں کو مقبولیت کا اثر دینے والا
وہ خالی دلوں کو اِرادوں کی دولت سے بھر دینے والا
فنا کے سمندر میں تشکیل دیتا ہے ساحل بقا کا
سیاہی کو روشن زمانوں میں تبدیل کر دینے والا

لامکاں اور مکاں کا مالک ہے
ہر بہار و خزاں کا مالک ہے
سب سفید و سیاہ تیرا ہے
تُو ہی دونوں جہاں کا مالک ہے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ چھپایا نہ ہم نے دنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

ماہیے

اَب اُس کو تانگھ نہیں
ورنہ بجنی کا
نمبر تو رانگ نہیں

ہیروں کی لڑی ہوگی
آخری ہیرے میں
مِری آنکھ جڑی ہوگی

ساون میں نہ بھادوں میں
ہم تو بھیگے ہیں
ساجن! ترے وعدوں میں

کچھ ہے اِن چیزوں میں
وہ بھی رہتا ہے
پرچی، تعویذوں میں

ہم عرضی نویس آئے
بیٹھو پہلو میں
تمہیں اُردو سلیس آئے

خاور اعجاز

ہائیکو

یہ میرے دو نین
ساجن تیری فرقت میں
رو رو کرتے بین

کیونکر دیکھے سپنے
خاک میں تجھ کو گاڑھیں گے
لوگ یہ تیرے اپنے

دل کا چین بتانے والے
تجھ کو اندھا کریں گے اک دن
تجھ سے نین لڑانے والے

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

خالد احمد کے نعتیہ مجموعے

"تشبیب" کا فکری، اکتشافی و عددی مطالعہ

قصائد پر مشتمل خالد احمد کا مجموعہ تشبیب جو 1984 میں شائع ہوا، قصائد کے اس مجموعے پر بہت کچھ لکھا گیا، مگر محترمہ سیدہ آیت گیلانی نے جس قدر باریک بینی اور دانش مندی سے اس مجموعہ کلام پر اظہارِ خیال کیا وہ یقینی طور پر قابل ستائش ہے۔ ہم سیدہ آیت گیلانی کے اس طویل فکری، اکتشافی اور عددی تجزیے کو قسطوں میں شائع کریں گے تا کہ ادب کے عام قاری تک بھی یہ تنقیدی جائزہ پہنچ سکے۔ [ادارہ]

(قسط # 3)

-----ہدیۂ عقیدت-----

تخیل کا بدن، خزینۂ فکر کا صدف
مثلِ سیپ جس میں بند موتی سے خیال
گُہرِ خیال کے شکم سے جنمتے
لامحدود ریشمی الفاظ
لفظوں میں آباد سنہرے معانی کا جہانِ لاتمام
وہ جہان کہ جس کے طول و عرض میں
دور تک مہکتے تفہیم کے معطر ابواب
ابواب بھی، بعید از عقل ابواب
مدحت و عقیدت سے پُر، خوشبوئے ولا سے تَر
عشق کے فلک پہ جھومتے، لہراتے، گُنگناتے

سیدہ آیت گیلانی

جذبوں کے پُر کیف سحاب
مَن کو مُن کرتے
ولا کے دشت پر اڑتے
وفا کے دیس میں برستے
چشم در چشم
قلب در قلب
روح در روح
بادِ سحر گاہی کے نم کی مانند
اترتے، اور اتر کر ساتے
بشر کو بندہ بناتے شاہا!!
تیرے فضائل بے حساب

(سیدہ آیت گیلانی)

==========

''تشبیب'' ایک ایسا مجموعۂ عقیدت ہے جس میں مدحتِ سرکارِ عالمین اس رنگ میں ہے کہ رنگ بھی محوِ رقص دکھائی دیتے ہیں۔ میں یہ بات کہوں گی کہ یہ مجموعہ عام قاری کے لیے ہے ہی نہیں یہ ایک خالص ادبی دستاویز ہے جس نے مدحتِ سرکار میں شاعری کو نئے اسلوب سے متعارف کرایا ہے۔ ''تشبیب'' کا ہر ہر شعر، بین المتن ایسے ایسے معنی و افکار تک رسائی کا موجب بن رہا ہے کہ میری عقل دنگ ہے -- ہائے خدایا یہ کیسا رنگ ہے۔

سبحان اللہ!!! --- ایک ''کُن'' اور وسیع و عریض کائنات --- اٹھارہ ہزار عالمین تو ایک طرف فکر کا دامن اسی کائنات کے دقیق علم کے سامنے نہایت مختصر ہے۔ فقط ''کائنات اور کُن'' کی حقیقت کو سامنے رکھوں تو تشبیب کی ''کلی کی اٹھان'' یعنی پہلا باب ہی ہزار رنگ سے منکشف ہوتا ہے --

غنچے کی چٹک -- کُن -- ہے۔ غنچہ چٹکا تو صدا ''کنت کنزاً مخفیا'' خوشبو کا پیراہن اوڑھ کر وہاں وہاں پہنچی جہاں جہاں تک ارادہ تھا۔ چونکہ ارادہ سرحد کی پابندی سے آزاد اور لامحدود تھا سو صدا بھی لامحدود تھی -- صدا ارادے کے سامنے سربسجود ہوتی گئے اور کائنات بنتی گئی -- بالالفاظ دیگر جہاں جہاں کُن اترا وہاں وہاں فیکون ابھرا

(یہ بھی قدرت کی اپنی منشا تھی کہ کہاں اتارنا ہے کہاں ابھارنا ہے)۔ جو جو ''فیکون'' کی صدا پہ ٹھہرا وہ کھنکھتا ہوا کان ہوا۔ کیونکہ صدائے کُن پہ لبیک کا نعرہ ''فیکون'' ہے۔ لبیک وہی کہے گا جو سنے گا -- کان عضو نہیں سماعت کی علامت ہے، سماعت جو فہم و ادراک کی سیپ کا بند موتی ہے --- یہی وجہ ہے کہ جب عالم ارواح میں ابدان ناپید تھے ارواح نے ''الست بربکم'' سنا بھی، سمجھا بھی اور جواب بھی دیا --

==========

''گزشتہ سے پیوستہ''

اک چٹکتی مہک ---- آوازوں کا جہاں
ہر مہکار الگ ----- ہر مہکار مہمان

.....

غنچہ چٹکتا ہے تو خوشبو بکھرتی ہے۔ خوشبو بھی اک صدا ہے۔ چونکہ ''کُن'' کی صدا لسانِ اللہ کی خاص ادا تھی لہٰذا اس بابرکت اور لامحدود کی مثل وہ ایسی بابرکت تھی کہ جب خوشبو کی طرح بکھری تو بکھرتی چلی گئی۔ جہاں جہاں وہ (الفاظ) تھا وہ وہاں وہاں پہنچی۔ لوح، قلم، کرسی، عرش، کیا سدرۃ المنتہیٰ کیا شجرِ طوبیٰ، کیا کوثر کیا سلسبیل، کیا فرشتے کیا ملک، کیا حور وغلماں، کیا رُسل و انبیا، کیا آسمانِ اول کیا تحت الثریٰ، کیا شمس وقمر کیا نجوم وکواکب، کیا دمن، کیا چمن کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آواز نہیں پہنچی۔۔ اور خصوصیتِ خاص یہ کہ کہیں دبی نہیں، کہیں رکی نہیں۔ عہدِ الست سے جو ابھری تو ابھی تک پوری آن، بان اور شان سے اپنے باوقار لہجے میں سفر جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔۔ آواز جو زندگی کی علامت ہے۔ زندگی جو اس کا ارادہ ہے۔

اس کا ارادہ قائم، قائم اس کی مرضی قائم کہ ''ہوگا تو وہی جو میرے (اللہ کی) مرضی ہے''

آواز باقی ہے
ارادہ باقی ہے
انسان باقی ہے
جہان باقی ہے

کیا ہی خوب لکھا ہے۔ اس قدر خوب کہ جتنا سراہوں اتنا کم ہے کیونکہ لفظوں میں چھپی حقیقت کی تائید کے لیے مجھ حقیر کی داد کم ہے۔۔ بلاشبہ حقائق کو موتیوں کی طرح لڑی میں پرو دیا ہے جناب خالد احمد نے۔

غنچہ چٹکا ---- یعنی زندگی کی ابتدا

زندگی اپنے ہونے کا اعلان آواز سے ہی کرتی ہے۔ جو بچہ دنیا میں خاموشی سے آکر خاموش رہے اس پہ ماتم کے سوا کچھ نہیں ہوتا -- یہ اور بات کہ ماتم بھی آواز ہے۔۔ آنے والا رو کر زندگی کا اعلان کرتا ہے۔ یعنی رونا ہی زندگی ہے۔

گریہ بھی آواز ہے
ماتم بھی آواز ہے
آواز ہی زندگی
آواز ہی موت ہے
آواز باقی ہے
جہان باقی ہے۔

==========

''کائناتِ اصغر''

ہر مہکار الگ ----- ہر مہکار مہمان

''تشبیب'' کے بین السطور مفاہیم کا جائزہ لیں تو یہ جُز سے کل کی طرف بہتا ایسا دریا

ہے جو موجود کو وجہِ موجود سے یوں ملاتا ہے کہ ہر قطرہ عرفان کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھائی دیتا ہے---اس مصرعے کو ہی لیجیے اس کے باطنی مفہوم میں موجود گہرائی اسے دوام بخشتی ہے۔ کائناتی حقیقتوں سے انکار ممکن نہیں۔دلیل یہ کہ گلشنِ رنگ و بُو میں جیسے ہر رنگ جداگانہ حیثیت کا حامل ہے اسی طرح اس دنیائے کرشمہ ساز میں ہر فرد منفرد اوصاف کا مالک ہے۔ علامت ادب کی دنیا کا وہ ست رنگی آلہ ہے جس کے ہر زاویے سے اک نیا رنگ منعکس ہوتا ہے۔اس علامتی مصرعے کا بھی یہی حال ہے۔
''مہکار'' کو بطور علامت دیکھوں تو اس سے شاعر کی مراد ''انسان'' بھی ممکن ہے۔ گلشن کائنات میں جو مقام و مرتبہ گلاب کا ہے چمنِ حیات میں وہی انسان کا ہے-- گلاب، گلشن کی زینت، انسان کائنات کی زینت - گلاب گلوں کا سردار ، انسان اشرف المخلوقات ،گلاب بوجہ خوشبو گلاب ، انسان بوجہ اخلاق و کردار انسان۔ ہر گلاب رنگت ، نفاست اور مہک میں اک دوسرے سے الگ بہار دکھاتا ہے۔ دنیا ارضی قطعات میں منقسم ہے سرحدوں اور جھنڈوں نے انسان کی اولین پہچان یہ خطے قرار دے دی ہے۔ان خطوں کے باسی اپنی نسل، زبان، فکر، اقدار، نظریات، روایات اور تہذیب و تمدن کے منفرد ڈھانچوں کے باعث جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی قوم یا ملک کا ہر باشندہ لیاقت، ذہانت، فصاحت، بلاغت، طہارت اور معرفت کے حوالے سے ایک دوسرے سے الگ ہے-- جیسے گلاب ہو کر بھی سارے گلاب ایک سے نہیں اسی طرح انسان ہو کر بھی سارے انسان ایک جیسے نہیں۔ ''مہان'' بڑی اور عظمت والی شے کے لیے مستعمل لفظ ہے مہکار کے مہان ہونے سے مراد انسان ہے۔ کہ گلاب اس کائنات کا جز ہے اور انسان کائنات کی ضرورت۔انسان بذات خود'' کائنات اصغر'' ہے۔جس طرح کائنات اکبر انسان پر پوری طرح نہیں کھلی کیونکہ اس کے بھید اس کے من میں چھپے ہیں۔اسی طرح ہر انسان کے اندر ایک انسان چھپا ہے جس کے قلب و روح میں کیا حشر بپا ہے؟ اس سے زمانہ آشنا نہیں۔ بقول باھوؒ

دل دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ھُو

شاید اسی لیے ندا فاضلی نے بھی کہہ دیا کہ---

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

....

مقامِ حیرت تو یہ ہے کہ انسان خود سے ہی

بے خبر جیتا بھی ہے اور مر بھی جاتا ہے-- شاید ایسے لوگ کبھی جیتے ہیں نہیں-- مراد یہ کہ اکثریت انسانوں کی ایسی ہے جو اپنے اندر کے انسان سے اجنبی ہے- زندگی گزر جاتی ہے مگر سفرِ حیات طے کرتے ہوئے وہ ندی کے کناروں جیسے دو آدمی جو بظاہر ایک دکھائی دیتے ہیں، اک دوسرے سے اجنبی ہی رہتے ہیں---

بخدا!!!!
ستم یہ تو نہیں
کہ سفر تمام ہوا
ظلم تو یہ کہ وقت نے
کبھی خود سے مجھے
ملاقات کا موقع نہ دیا

''ہر مہکار مہمان'' یہ سہ حرفی مدلل مصرع بحرِ مفاہیم ہے - جناب خالد احمد کے قلم نے کائناتی تنوع کو جس فصاحت و بلاغت سے بیان کیا ہے وہ لائقِ تحسین ہے- اس مصرع کی ادبی رعنائی کو ایک طرف کر کے دیکھیں تب بھی علمی و فکری گہرائی نے اس کا قد اور بھی اونچا کر دیا ہے- بلا مبالغہ ان تین حرفوں پہ مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے-

==========

ہجر کے اندیشے ------ وصلوں کے سامان
کان میں ہر گل کے ----- شبنم دے یہ اذان
سیج کی بھینٹ چڑھیں--- یا ہوں قبر مکان
پھولوں کی منزل---- گلچیں کا داماں

جہان بے ثبات میں کسی کو دوام نہیں- میر تقی میر بھی کہہ گئے

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

.....

ازل سے یہ قانون فطرت ہے کہ جو لکھا وہ مٹے گا، جو بنایا وہ بگڑ جائے گا- عروج و زوال اس دنیا کے دو دروازے ہیں- ایک داخلی ایک خارجی-- انسانی حیات کا سب سے بڑا عروج ابتدائے زندگی اور سب سے بڑا زوال موت ہے-- مثل مشہور ہے کہ جان ہے تو جہان ہے- جب موت کا جام لبوں سے لگتا ہے تو نہ جان باقی رہتی ہے نہ جہان-- جب بندہ ہی نہ رہا تو پھر کچھ رہے یا نہ رہے، فرق ہی کیا پڑتا ہے- طے ہے تو بس یہی کہ جو آیا ہے اسے جانا ہے-- جس نے آنا طے کیا، کب جانا ہے؟ آنے سے پہلے یہ بھی وہی طے کرتا ہے- انسان تہِ خاک منزل نشیں ہوگا اور طے کرنے والا جو قبل بھی موجود تھا بعد میں بھی رہے گا--

جیسا کہ سورۃ رحمٰن کا دعویٰ ہے:-

''کل من علیھا فان''
ہر شے فنا ہونے والی ہے
''ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام''
اور باقی رہے گا تو وجہ اللہ (اللہ کا چہرہ)

تشبیب کی پہلی سیڑھی کا انت دنیا کی بے ثباتی

پر ہوتا ہے۔ دنیا جو فانی ہے اور یہاں ہر کسی کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ سیج کی زینت بن کر فنا ہوں یا قبر کی مٹی میں خاک ہوں۔۔ خاک ہونا سبھی کا مقدر ہے۔۔ یہاں بات کو جس خوبصورت پیرا ہن سے زینت بخشی گئی ہے وہ دل کو چھو لینے والا ہے۔ ذو معنی مفہوم اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہے۔۔ سیج خوش قسمتی اور بلند بختی یعنی اقتدار و عروج کی طرف اشارہ ہے۔ قبر مکان ہونا۔ مٹی میں ''رُلنا'' غربت کی نشانی اور زوال کی علامت ہے۔۔ مراد یہ کہ شاہ ہو یا گدا موت سب کے گھر کی مہمان بنے گی۔۔ کوئی بھی اس کی دسترس سے بچ نہیں سکتا۔۔۔ تخت و تاج، لشکر و سپاہ کچھ بھی کام نہ آئے گا جب بلاوا موت کا آئے گا بقول نظیر اکبر آبادی:

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

.....

بشر ہو یا گل انت، اخیر ہر نفس کی موت ہے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا لمحہ بھی آئے گا کہ موت بھی مر جائے گی۔ علما و مفسرین بیان کرتے ہیں کہ معراج کی رات جب ہادی برحق، مظہرِ کبریا، حبیب خدا، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیر کرتے کرتے ساتویں آسمان پر پہنچے تو آپ نے ایک ایسا فرشتہ دیکھا جس کی انگلیوں سے شاخ در شاخ لاتعداد انگلیاں پھوٹی ہوئی تھیں جنھیں وہ تیزی سے سامنے پڑی تختی پر مسلسل حرکت دے رہا تھا۔ (ہمارے علم و عرفان میں اضافے کی خاطر) شاہ دو عالم نے اس فرشتے سے سوال کیا کہ

''اے فرشتۂ خدا تو کون ہے اور کیا کر رہا ہے؟''

اس نے پہلے تو آپ کو عقیدت سے جھک کر سلام کیا اور پھر کہا کہ

''یا رسولؐ اللہ میں ملک الموت ہوں اور موت بانٹ رہا ہوں''۔

آپؐ کے چہرۂ اقدس پہ تبسم کی اک لہر ابھری اور پھر سوال کیا کہ

''کیا تم موت بانٹتے رہو گے یا کبھی خود بھی مرو گے؟''

ملک الموت نے ادب سے جواب دیا کہ

''جس دن خالق نے قبضِ ارواح کا رجسٹر مجھے دے کر یہ منصب مجھے سونپا تھا آگاہ کر دیا تھا کہ قیامت کے دن جب صورِ اسرافیل پھونکا جائے گا تو ہر شے کو موت نگل لے گی، موت کا راج ہو گا جس سے بچوں گا میں بھی نہیں''

علماء نے اس واقعے کے ضمن میں جو حقیقت بیان کی ہے وہ کچھ ایسی ہے کہ موت ایسے زمین کے ذرے ذرے پر قابض ہو جائے گی جیسے ذرے ذرے میں زندگی کی اجارہ داری تھی۔ ہو گا یہ کہ ہر نفس موت کا ذائقہ چکھ کر

حیات کے پہلو سے اٹھ جائے گا تو کائنات پر سناٹا چھا جائے گا۔ یکلخت ایک آواز سوال بن کر گونجے گی۔۔

''ہے کوئی جو باقی بچ گیا ہو؟''

جواب آئے گا

''ہم آٹھ (فرشتے) باقی ہیں جنھوں نے عرش کو کندھوں پہ اٹھا رکھا ہے۔''

رعب دار لہجے میں بادل سی گرج لیے کوئی بولے گا

''ہمارا عرش تمھارا محتاج نہیں، تم بھی مر جاؤ، تم سے پہلے بھی یہ کاروبار چلتا تھا''

وہ آٹھ بھی مر جائیں گے تو ایک بار پھر پہلے والا سوال دہرایا جائے گا کہ

''ہے کوئی جو باقی بچ گیا ہو؟''

تب ملک الموت کی آواز آئے گی

''اے عالی قدر!!!! میں باقی''

ملک الموت کے یہ کہتے ہی حکم ہوگا کہ

اب تک تم نے موت بانٹی، اب ضروری ہے کہ تم بھی موت کا ذائقہ چکھو، آج تم بھی مر جائے''

نہ زندگی بچے گی نہ ملک الموت کی ضرورت رہے گی۔۔

وہی رہے گا جو اس جہانِ رنگ و بو کا کھیل رچانے سے پہلے بھی باقی تھا۔ جس طرح ہر شے اصل سے جا ملے گی اسی طرح خاک اپنے خمیر سے جا ملے گی۔ قیامت نام ہی قہار کے اسی قہر کا ہے کہ ''لا'' کی منزل سے گزر کر ہر علم، ہر عالم اور ہر معلوم، معلوم سے معدوم ہو جائے گا۔۔

باقی بچے گا تو وہ

اس کا ارادہ

اس کا چہرہ

اس کی زبان

اس کی آواز

اس کا لہجہ

جو پکار پکار کر کہے گا

''ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والکرام''

بیشک وہی خدا ہے جو ازل سے پہلے تھا، ابد کے بعد بھی رہے گا۔۔۔۔

ابھی تو ہے کتاب باقی

ابھی تو ہے حساب باقی

ابھی تو ہے خطاب باقی

کسی کے دستِ قدرت میں

پل رہا ہے وہ ایک لمحہ

نہ رہے گا جب حجاب باقی

نہ کوئی سوال باقی

نہ کوئی جواب باقی

بچے گا تو فقط وہی

جو ہے ''خمستانِ ازل کا ساقی''

جو ہے بے حساب باقی

[جاری ہے۔]

سِلور پینی (Silver Peni)

آخر آدھی رات کو تمھیں یہ ڈراما رچانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔ صبح ہونے کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔''

ماں نے دھیمی آواز میں سمن کو گھر کا۔

سمن نے بڑے دکھ سے ماں کو دیکھا مگر خاموش رہی۔ وہ سوچ رہی تھی لوگ بڑے ہو کر اتنے کٹھور کیوں ہو جاتے ہیں۔ کیا پتہ اسے اب مدد کی ضرورت ہو۔ کیا پتہ صبح تک کیا ہو جائے۔ وہ اندر ہی اندر کانپ گئی۔

اُس نے تو ماں کے بیڈ روم میں چلے جانے کی تھوڑی دیر بعد پولیس کو فون کیا تھا اور خود باہر نکل کر دروازے پر کھڑی ہو گئی تھی تا کہ پولیس کو گھنٹی نہ بجانی پڑے اور ماں کو پتہ نہ چلے مگر عین اُس وقت جب پولیس کار پہنچی اور ابھی آفیسر اُس میں سے اُترا ہی تھا کہ ماں جو غالباً کچن سے کچھ لینے آئی تھی اُس نے کچن کی کھڑکی میں سے پولیس کار اور بیٹی کو پولیس آفیسر سے بات کرتے دیکھ لیا۔ وہ باہر آ گئی۔ آن کی آن میں دوسری اور پھر تیسری کار بھی آ گئی۔ اور وہ تینوں سمن کی رہنمائی میں سوزین کے گھر کی طرف چل پڑے ماں بھی ساتھ چل پڑی۔

گھر کے سامنے پولیس افسران جن میں ایک لیڈی پولیس آفیسر تھی اُس نے ماں بیٹی کو ہدایت دی کہ ''آپ لوگ یہیں باہر کھڑے رہیں ہم پتہ کر کے آتے ہیں۔''

وہ گھنٹیاں بجاتے رہے مگر کوئی جواب نہ ملا۔ انھوں نے ٹارچ جلا کر سمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا دروازے پر لگا ہوا نوٹ پڑھا۔

لیڈی پولیس آفیسر اِنکی طرف آئی اور سمن سے پوچھا۔ ''کیا تم اس لیڈی کی کیئر ٹیکر ہو۔ پرائیویٹ یا سوشل سکیورٹی کی طرف سے؟

''نہیں، وہ صرف میری دوست ہے۔''

لیڈی آفیسر نے دھان پان سی نوعمر سمن کو سر

فرحت پروین

سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ واپس اپنے ساتھیوں سے جا ملی۔

لیڈی آفیسر پھر ان کی طرف آئی اور سمن سے مخاطب ہوئی۔ ''ممکن ہے وہ کہیں گئی ہوئی ہو۔''

''مگر اُسکے گھر کا دروازہ غیر مقفل ہے۔''

''وہ عمر رسیدہ عورت ہے ممکن ہے وہ تالا لگانا بھول گئی ہو۔ ممکن ہے وہ اکثر تالا نہ لگاتی ہو۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ اُس نے سوال کیا۔''

''میں جانتی ہوں۔ کیونکہ جب میں نے اُسے اپنی ہائی سکول کی گریجویشن پر بلایا تھا تو اُس نے ربن میں پروئی ہوئی چابیاں گلے میں پہنی ہوئی تھی اور جب واپسی پر میں اُسے چھوڑنے گئی تھی تو اُس نے چابی گلے سے اتارے بغیر جھک کر تالا کھولا تھا۔''

پولیس آفیسر مسکرا دی مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے چہرے کی پیشہ ورانہ سنجیدگی لوٹ آئی۔

''جب تم اتنا کچھ جانتی ہو تو تمھیں اُس کے گھر کا نمبر کیوں نہیں معلوم تھا کہ تم پولیس کو اپنے گھر بلا کر گھر دکھانے ساتھ آئی ہو۔''

ماں نے کڑی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا نمبر دیکھنے کا۔ اتنے قریب ایک ہی سڑک پر تو رہتی ہے۔''

''آں ہاں'' آفیسر نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور وہ واپس مڑ گئی پولیس آفیسرز بڑی بڑی ٹارچیں جلا کر گھر کے اندر چلے گئے۔

''یہ تو نیکی برباد گناہ باقی والا قصہ ہو گیا ہے۔ اچھا صلہ مل رہا ہے تمھیں ہمدردی کا'' ماں فکرمندی سے بولی۔

سمن خاموش رہی۔ وہ تو سوزین پر ترس کھا رہی تھی اور نہ نیکی کما رہی تھی۔ وہ اُسے سچ مچ دوستوں کی طرح چاہتی تھی۔ اُس کی شخصیت کی وجہ سے۔ وہ اُس کے لیے فکرمند تھی اور وہ دل ہی دل میں اُس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگی۔

گزشتہ واقعات کی فلم اُس کے ذہن میں پردے پر چل رہی تھی۔

جب انھوں نے اس علاقے میں گھر خریدا تھا تو وہ بہت چھوٹی تھی۔ ابھی نئی نئی تیسری جماعت میں آئی تھی۔ وہ سڑک پر سکیٹنگ کرتی ہوئی اُس کے گھر کے سامنے سے گزری تو اُس نے سوزین کو زا اپنے لان میں کام کرتے ہوئے دیکھا اُس نے اُسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ''ہیلو پیاری لڑکی''

وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ واپسی میں وہ اُس کے پاس رُکی اور اُس سے پوچھا۔

''کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''اوہ، تو ننھی پری میری مدد کرنا چاہتی ہے۔ اگر مجھے مدد کی ضرورت نہ بھی ہوتی تو بھی میں تمھاری پیشکش قبول کر لیتی تاکہ تمھاری خوبصورت معیت میں تھوڑی دیر خود کو تر و تازہ کر سکوں۔''

اور یوں اُن کی دوستی ہوگئی۔ وہ اُسکے چھوٹے سے لان کی دیکھ ریکھ میں اُس کی مدد کرتی۔ کبھی کبھی وہ وہ اُسے اندر بلالیتی۔ اپنی شاپنگ دکھاتی کبھی کبھار وہ باتھ ٹب میں پانی سے بھر کر اُس میں اپنی اپنی کاغذ کی کشتیاں تیراتے اور بیٹھ دیکھتے کہ کس کی کشتی آخر تک تیرتی ہے۔ وہ بالکل بچوں کی طرح ایمانیاں بھی کرتی۔ جب اُس کی کشتی ڈوبنے لگتی تو وہ اُسے اُٹھالیتی۔ ''میں نے سوچا۔ ''تم جیت جاؤ۔ اوکے.....اوکے تم جیت گئیں'' اور وہ تالیاں بجانے لگتی۔

نہیں تم نے Cheating کی ہے۔ سمن منہ پھلالیتی۔

''چلو Penality لے لو۔'' وہ اُسے بسکٹ یا کیک کا ٹکڑا پکڑا دیتی۔

وہ بالکل برابر کی عمر کی دوستوں کی طرح باتیں کرتے۔ یہ اپنے سکول کی باتیں سناتی اور وہ اپنے۔

لیڈی آفیسر پھر سے نمودار ہوئی اور اُس سے پوچھا۔ کیا اس کے بچے ہیں اور اگر ہیں تو کہاں رہتے ہیں؟

''ہاں، بچے ہیں اِس کے۔ یہ اپنی بیٹیوں کا ذکر کرتی ہے۔''

''کہاں رہتے ہیں؟'' اُس نے اپنا سوال دہرایا

''مجھے نہیں معلوم۔ میں نے سوزین سے کبھی کچھ نہیں پوچھا۔ وہ خود ہی جو کچھ بتاتی ہے میں سنتی رہتی ہوں۔''

''پاس پڑوس کے لوگوں کو معلوم ہوگا۔ وہ اس گھر میں ہمارے آنے سے پہلے سے رہتی ہے۔'' ماں نے آفیسر کو بتایا۔

''آپ لوگ کب سے یہاں ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''بارہ سال سے'' ماں نے جواب دیا۔

''میں دراصل اب کالج میں پڑھنے دوسرے شہر چلی گئی ہوں۔ چھٹیوں میں آئی تھی۔ سوزین سے ملنا چاہتی تھی۔ میری اُسکی بچپن کی دوستی ہے۔'' سمن نے بھولپن سے کہا۔ آفیسر واپس چلی گئی۔

سمن پھر سے اپنی سوچ میں کھوگئی۔ ''سوزین اتنی محبت کرنے والی، اتنی زندہ دل اور اچھی ہے۔ وہ بڑے مزے سے اپنے سکول اور کالج کے زمانے کے قصے سناتی ہے۔ اُس نے میوزک پڑھا تھا اور اپنے بینڈ کے ساتھ امریکہ کے مختلف شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس کے پاس اب بھی پیانو تھا۔ جسے وہ سمن کو بجانے دیتی اور خود پاس کھڑی مسکراتی رہتی۔ حالانکہ وہ خود میوزک ٹیچر ہے پھر بھی اُس کے اوندھے سیدھے بجانے پر کبھی نہیں ٹوکتی۔ وہ اب بھی پرانے قصے سناتے ہوئے ہنس ہنس کر لال گلال ہوتی ہوئی کمسن لڑکی لگنے لگتی ہے۔

''اپنی شادی کا قصہ بھی بہت مزے سے سُناتی ہے۔ ''میری ماں نے شادی کے لیے میرے لیے جو لڑکا پسند کیا وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس لیے جس دوسرے لڑکے نے

مجھے شادی کی پیشکش کی۔ میں نے فوراً منظور کرلی۔"

وہ اکثر اپنی بات درمیان میں ادھوری چھوڑ کر دوسری بات شروع کر دیتی اور دوسری بات سناتے سناتے اُسے جیسے ہی پہلی بات یاد آتی وہ دوسری کو ادھورا چھوڑ کر پہلی کو مکمل کرنے لگتی۔ سمن کو بات کے تسلسل سے زیادہ اس بات کا خیال رہتا کہ اُسے احساس نہ ہو کہ وہ بات کرتے کرتے بھول جاتی ہے۔ اس لیے بڑی دلچسپ سے بیٹھی سُنتی رہتی۔

وہ اپنے سرجری اور ڈاکٹروں کے قصے یوں مزے مزے سے سناتی جیسے کسی دلچسپ کہانی کی روداد۔ اُس نے بتایا کہ "تم لوگوں کے آنے سے ایک برس پہلے میرا بہت بُرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا کئی ہڈیاں چُور چُور ہوگئیں۔" وہ یوں ہنسنے لگی جیسے کوئی لطیفہ سُنا رہی ہو۔"

"بے بی میں تم سے زیادہ مضبوط ہوں میری ہڈیاں لوہے کی ہیں۔" پھر وہ بالکل بچوں کی طرح مٹھیاں بھینچ کر اور بازوؤں کو سینے پر کراس کر کے ایک لے میں بولی۔ آئی ایم این آئرن لے.....ڈی ی ی ی

(I am in Iron Lady)

"اس سے تمھیں گھٹنے موڑنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی۔" اس نے پوچھا تھا۔

"ہوتی ہے اس لیے میں گھٹنے موڑتی ہی نہیں۔" وہ زور سے ہنسی

"بیڈ روم جو اوپر ہے تو سیڑھیاں....." سمن نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کہ اُسے احساس ہوا تھا کہ اس سوال کی کیا ضرورت تھی۔

"اس کا تو بہت آسان حل ہے ذرا سی دیر کو بھالو بن جاؤ۔ ایسے....."

اور وہ حیرت انگیز پھرتی سے بچوں کی طرح سیڑھیوں پر ہاتھ ٹِکا ٹِکا کر پتہ نہیں کیسے گھسٹتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔

آئی ایم ہیر سیم (I am here sam)

اُس نے اوپر پہنچ کر نعرہ لگایا۔ "اب میں نیچے نہیں آرہی تم نے آنا ہے تو اوپر آجاؤ۔"

"نہیں میں چلتی ہوں اب"

اُسے اس طرح سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر اُس کا دل دکھ گیا۔ زندگی کے ہر نشیب و فراز کے ساتھ خوشی خوشی تن تنہا جینے کا یہ ہُنر، کتنی پیاری ہے یہ خاتون۔

وہ اپنے لیے پیدل ہی جا کر گروسری سٹور سے سودے لے آتی جو اتنا قریب بھی نہیں تھا۔ کئی بار سمن نے آفر کی۔ وہ ایک دو بار سودا لے کر آتی ہوئی راستے میں مل گئی تو بھی اُس اپنے گھر تک گاڑی میں لفٹ لینے سے بڑی نرمی سے انکار کر دیا۔

"میں واک کرنا چاہتی ہوں لٹل اینجل (Little angel)۔"

وہ کبھار کبھار سمن کے لیے بھی بسکٹ، چاکلیٹ یا کوئی اور چھوٹا موٹا تحفہ لے آتی جو اُسے ساری دنیا سے قیمتی لگتا۔

پچھلی بار کوئی دو مہینے پہلے وہ اُس کے لیے

ایک ٹہنی لے آئی جس کے اوپر گول گول روپہلے پتے تھے۔

''اسے سلور پینی کہتے ہیں ننھی پری۔ یہ ہمیشہ ایسے ہی رہتے ہیں۔ جب یہ تازہ ہوتے ہیں تو بھی ان پتوں کا رنگ ایسا ہی ہوتا ہے۔

میرے پاس یہ کب سے ہے۔ بہت کامیاب ہے۔ اسے تم اپنے کمرے میں سجالو۔

''اچھا'' سمن نے احتیاط سے اس ٹہنی کو پکڑ کر تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہمیشہ شاداب رہتی ہے۔ پھر تو یہ تم ہو سوزین''

''ہاں میم، یہ میں ہوں۔ ہمیشہ تمھیں اپنی یاد دلانے کے لیے'' اُس کے لہجے میں اُداسی در آئی اور سمن کو لگا جیسے اُس کی آنکھوں میں نمی چمکی ہو۔

''چلو، آج بیک یارڈ میں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں'' سمن نے پیشکش کی۔

''نہیں میم، میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیا ہوا سوزین تم ٹھیک تو ہو۔''؟

''ہاں، پیاری پری۔'' اُس نے اُس کا گال تھپتھپانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر پھر واپس کھینچ لیا اور ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

''بہت کھردرے ہیں نا'' اور شرمندہ سی ہو کر ہاتھ گرا دیے۔ اُسی لمحے وہ اتنی معصوم اتنی پیاری لگی کہ سمن نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

''نہیں، میں نے اس سے خوبصورت ہاتھ کبھی نہیں دیکھے۔''

''تم تو سچ مچ بڑی ہو گئی ہو میری ننھی دوست'' اُس نے سمن کے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''فنکار ہاتھ ہمیشہ خوبصورت ہوتے ہیں وہ حسن تخلیق کرتے ہیں۔ تم پینٹنگ کرتی ہو نا۔''

''اور تم میوزک تخلیق کرتی تھیں نا خوبصورت لیڈی۔''

اور وہ دونوں ہنس دیں۔

''زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ نا میم؟''

''ہاں زندگی بھی خوبصورت ہے اور اُس کے حسن کو سراہنے والی بھی'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

وہ واقعی خوبصورت ہے۔ ابھی بھی اُس کی شکل پر کیسی ملائمت ہے۔ جوانی میں تو انتہائی حسین رہی ہوگی۔

''بڑی دیر لگا دی۔ پتہ نہیں کیا کر رہے ہیں۔'' ماں کھڑے کھڑے اُکتا گئی۔

''اماں'' آپ چلی جائیں میں آ جاؤں گی۔''

''نہیں ایک ساتھ چلیں گے۔''

''اماں، یہاں کی پولیس اچھی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔

''ہاں، سنتی رہتی ہوں واقعات''

''ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔''

''کون جانے وہ بہت کم کب ہو جائے۔ ہوشیار رہنا چاہیے۔''

"ٹھیک ہے" سمن نے کہا۔ "تو یہ کیسے بے اعتبار ہو جاتے ہیں بڑے ہو کر یہ لوگ" اس نے بدمزہ ہوتے ہوئے سوچا۔

اور اُس کا دھیان پھر سے سوزین میں جا پڑا۔ ایک روز اُس نے بتایا تھا کہ اُس کا شوہر کیمسٹ تھا۔ "مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ نشے باز ہے اُس نے سٹور کے فریج میں شراب رکھی ہوئی تھی۔ جسے کہ مستقل پیتا رہتا تھا۔ کثرت شراب نوشی نے اُس کے گردوں کو تباہ کر دیا۔ وہ بہت بیمار رہنے لگا اور ایک رات وہ ایسا سویا کہ پھر نہیں اُٹھا۔ وہ کیمسٹ تھا اُس نے کوئی دوائی کھا کر خودکشی کر لی تھی وہ اپنی صحت کی خرابی سے تنگ آ گیا تھا۔ یہ تم جس گھر میں رہتی ہو۔ یہاں ایک سرجن رہتا تھا وہ ہمارا دوست تھا۔ اُس نے خاموشی سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ دے دیا ورنہ تو پولیس کیس تھا اور بات مجھ پر آتی کہ میں نے اُسے قتل کیا ہے حالانکہ اُس کی کوئی جائیداد یا لائف انشورنس تو تھی نہیں۔ میرے بچے ابھی سکول میں تھے۔ پل گئے، پڑھ گئے۔ سب ہو گیا سیم۔"

وہ کہتی ہے کہ اس کی ایک بیٹی اسی شہر میں رہتی ہے اور اُس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ مگر اُس نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ سوزین نے اپنی کسی مشکل یا تنہائی کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ اُسے کسی سے کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ اُس نے پچھلی بار اُسے بتایا تھا کے وہ اپنی یادداشتیں لکھ رہی ہے اور اُس کا سب رشتہ داروں سے رابطہ رہتا ہے۔

وہ اُسے تب سے جانتی ہے جب وہ پرائمری سکول میں تھی اور اب تو کالج میں ہے۔ دو ماہ پہلے وہ اپنی عمر بانوے سال بتا رہی تھی "زندگی کتنی خوبصورت ہے سیم۔" اُس نے کہا تھا۔

مگر آج اُس کی غیر معمولی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ آج صبح کے قریب اُس نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی تو سوزین کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کولر تھا۔ اور چہرے پر خلاف معمول اُداسی تھی۔ اُس نے حسب عادت مسکرانے کی کوشش کی مگر اُس کی آنکھیں اُداس ہی رہیں۔ اُس نے کولر کچن کاؤنٹر رکھ دیا اور خود کاؤنٹر سے ٹیک کر کھڑی ہو گئی۔ سمن اپنے لیے سینڈوچ بنا رہی تھی۔ ایک سینڈوچ تمھارے لیے بھی بنا دوں اُس نے سوزین سے پوچھا مگر اُس کے جواب نہ دینے پر پلٹ کر اُسے دیکھا اور حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ سوزین آہستہ آہستہ دھندلاتی جا رہی تھی شفاف ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اُس شفاف سوزین کے اندر بالکل اُس کے جیسی ایک چھوٹی سی بچی نے مسکرا کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ پھر وہ بھی دھندلا گئی اور سوزین ہلکی ہو کر ایک پَر کی طرح اُڑنے لگی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کولر کھولا شاید کوئی سراغ ملے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُس میں

صرف ایک کاغذی کشتی تھی جو بھیگ کر ڈوبنے والی تھی۔

اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب تو خواب ہوتے ہیں اس نے خود کو تسلی دینا چاہی مگر گھبراہٹ کم نہ ہوئی۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ ابھی صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔ جوں توں کر کے اس نے نو بجنے کا انتظار کیا اور اس سے ملنے چلی گئی۔ دروازہ اگرچہ غیر مقفل تھا مگر گھنٹی بجانے پر کوئی جواب نہ آیا میں نے دن میں کئی چکر لگائے مگر صورتحال وہی رہی۔ آخر وہ دروازے پر نوٹ لگا کر چلی آئی کہ وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ لوٹنے پر اس سے رابطہ کرے گی۔ پھر وہ اپنی فیملی کے ساتھ باہر کھانے پر چلی گئی۔ واپس لوٹنے پر اُس نے دیکھا کہ اُسکا نوٹ ابھی تک اسی طرح دروازے پر لگا ہوا ہے۔ اپنا خواب اُس کے ذہن پر مسلط تھا اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور آخر اُس نے پولیس طلب کر ہی لی۔ اور تب پولیس والے باہر آ گئے۔ ''وہ ٹھیک ہے نا۔ وہ گھر میں ہی ہے نا؟'' سمن نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں'' آفیسر نے رسان سے کہا۔

''اچھا۔ اب آپ لوگ گھر جائیں۔''

''کیا وہ سو رہی ہے۔'' سمن نے پوچھا۔

''رات کے دو بجے رہے ہیں بیٹا'' ماں نے یاد دلایا۔

''ٹھیک ہے میں اُسے صبح مل لوں گی۔''

اور وہ دونوں مزید کچھ کہے بغیر اپنے گھر کی طرف چل پڑیں۔

اور اندر سوزین وہ پھولدار فراک پہنے جو سمن اُس کے لیے پچھلی بار لائی تھی۔ اُس کے اپنے باغیچے کے گلدستہ جو گلابی ربن سے بندھا ہوا تھا اور جس کے ساتھ بندھے گلابی کارڈ پر لکھا ہوا تھا

''میری تنہائیوں کی ساتھی - میری ننھی دوست سمن کے لیے

دل و جان کی پوری محبتوں کے ساتھ''

گلدستہ ذرا دور پڑا تھا جیسے اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا ہو۔ وہ فرش پر چت پڑی تھی۔

''اسے مرے ہوئے بارہ گھنٹے ہو گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے چیک کر کے بتایا۔

لڑکی کی چھٹی حس ٹھیک تھی پولیس آفیسر ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے۔

سمن بے دلی سے چلتی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس کا دل نجانے کیوں اب بھی بے چین تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے پر اُس کی نظر سلور پنی پر پڑی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس نے سلور پنی کی شاخ کو احتیاط سے اُٹھایا اور پھر آہستگی سے وہیں رکھ دیا۔

کل وہ سوزین کو بتائے گی کہ اُسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اُس سے کتنی محبت کرتی ہے تو وہ کتنی خوش ہو گی۔

☆☆☆☆☆

بیٹے کی واپسی

زندگی لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ محبت سے پالنے پوسنے کا نام ہے۔ محبت جو رگوں میں زندگی دوڑاتی ہے۔ تازگی دیتی ہے سانسوں کو ہرا رکھتی ہے۔ جڑوں کو تازہ اور فضاؤں کو پر کیف بناتی ہے۔ ہوا میں پرندوں کے چہچہے بکھیرتی ہے۔ رنگ بکھراتی سبزے کی چمک دکھاتی ہے محبت کی کیا بات ہے۔ وہ اکثر حبیبہ کو یونہی اپنی محبت کا یقین دلاتا رہتا۔ شادی کے سات سال بعد رفیع اللہ پیدا ہوا تھا۔ تو محبت دو چند ہو گئی۔ حبیبہ تو محبوبہ تھی پہاڑوں میں رہنے والی، جو پہاڑی سیبوں کی طرح تازہ دم خوشبودار اور طرح دار تھی۔ سمیع اللہ جو کبھی سیر کے لیے اوشو کے ان پہاڑوں میں آیا تھا۔ پھر دریائے اوشو کے عشق میں ایسا مبتلا ہوا کہ ان پانیوں سے ہاتھ نہ چھڑا سکا۔ اس نے بلند و بالا پہاڑوں پر چھوٹا سا گھر بنا لیا اور پھر شہر آتے جاتے جڑی بوٹیوں سے دیہاتیوں کا علاج کرتے کرتے اُسے حبیبہ مل گئی۔ سمیع اللہ کو یوں لگا جیسے اس کے دل کا آدھا حصہ حبیبہ کے پاس ہے۔ حبیبہ جو شہر سے سیاحت کے لیے آئی تھی ان پہاڑوں ندی نالوں اور جنگلوں میں اپنا دل گنوا بیٹھی ۔ اتنی دہشت ناک خوبصورتی کہ دامن نہ بچا سکی۔ گلیشیرز نے پاؤں پکڑے تو حسین جھیلیں، پوروں میں سما گئیں۔ ان ندیوں جھرنوں میں کلیلیں بھرتی ہرنی کی طرح وہ جو والدین کی اکلوتی تھی۔ ذرا سی آنکھ نم ہوتی تو ماں باپ میلوں میل اندر سے خالی ہو گئے۔ جیسا تم کہو۔ وہ تو لٹنے کو تیار تھے بس ایک ڈیڑھ سال کے اندر حبیبہ سمیع اللہ کی دلہن بن کر کالام کے اس چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں آ گئی جہاں دریائے سوات کا شور اُسے اپنی اور بلاتا رہتا۔ شوہر کے ساتھ سارا دن جنگلوں میں پھولوں پودوں درختوں سے اٹھکیلیاں کرتے جڑی بوٹیاں جمع کرتے وہ خود بھی آدھی حکیم ہو گئی تھی۔ سمیع اللہ بے شک ساؤتھ کا تھا مگر اتنا گورا چٹا شربتی آنکھوں اور سنہری بالوں والا کے ان پہاڑوں کا شہزادہ ہی بن گیا۔ راولپنڈی کی رہنے والی حبیبہ تو ناز نخرے کی شہزادی۔ بہت سال گئے۔ حبیبہ کے

آسناتھ کنول

ماں باپ اپنا گھر حبیبہ اور سمیع اللہ کے نام کر گئے۔ سمیع اللہ نے جس کو کرائے پر چڑھا دیا اور حبیبہ کے والدین کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد واپس اپنے محبوب پہاڑوں میں پہنچ گیا۔ سمیع اللہ تو تھا ہی اکیلا۔ اب حبیبہ بھی اکیلی رہ گئی دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ غم گسار، اب وہ قدرے اداس اداس رہنے لگے تھے۔ سات سال گزر گئے تھے جب سوکھے تنے میں جان پڑی کونپل نے اپنا روپ دکھایا۔ امیدیں جی اٹھی تھیں، مگر حبیبہ کی حالت اچھی نہ تھی۔ وہ اُسے پہاڑوں سے پنڈی لے آیا اس کے گھر جہاں اس کے ماں باپ کی خوشبو تھی ان کی دعائیں تھیں۔ حبیبہ بہتر محسوس کرنے لگی۔ یہاں بھی اُس نے دکان کھول لی۔ بیٹے کی آمد نے تو سارے جہان کی خوشی اس کی جھولی میں ڈال دی۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار پہاڑوں کا چکر لگاتا۔ بیوی بچہ پنڈی میں ہی رہتے۔ گرمیوں میں وہ کالام چلے جاتے۔ بیوی کی کمزور حالت نے دوسرے بچے کی اجازت ہی نہ دی۔ وہ اسی پر راضی تھے خوش تھے۔ وقت گزرنے لگا۔ بیٹا پڑھ لکھ کر۔ گورنمنٹ کے ایک ادارے میں نوکری پہ لگ گیا۔ حبیبہ اب بہت کمزور اور بیمار رہنے لگی تھی۔ بس بیٹے کی شادی کی خواہش کی۔ یوں ہمسایوں میں ہی ایک اچھے خاندان کی پیاری سی بچی دیکھ کر شادی کر دی۔ گھر میں کتنی رونق آ گئی تھی۔ ٹمٹماتے دیے کی آخری لو کی مانند وہ چند دن اچھی رہی پھر داغ مفارقت دے گئی۔ سمیع اللہ کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی بولایا پھرتا۔ چالیسویں کے بعد بیٹے سے اجازت لی۔ دیکھو رفیع اللہ میری زندگی تو چلی گئی۔ تم خوش رہو۔ مجھے میرے پہاڑ بلاتے ہیں۔ کبھی کبھی آیا کروں گا تمہارا دل کرے تو ضرور ملنے آ جایا کرنا وہ چھوٹا سا گھر بھی تمہارا ہی ہے۔ اب تو میں بھی مسافر ہی ہوں۔ رفیع اللہ کافی اُداس ہوا مگر، شائستہ بہت خوش تھی اک بیمار اور کمزور بوڑھے سے جان چھوٹ رہی تھی۔ بوڑھے نے اپنا بیگ اُٹھایا اور کالام پہنچ گیا۔ پرانے دوست کتنی ہی دیر افسوس کرتے رہے۔ نئی نسل کتنی تیزی سے جوان ہو گئی تھی۔ سمیع اللہ نے نئے سرے سے دکان شروع کی۔ پھر سے وہی روٹین جڑی بوٹیاں تلاش کرنا اور لوگوں کا علاج۔ حبیبہ کے بغیر بھلا زندگی کیسی ہو گی وہ خود کو یکسر بھلا دینا چاہتا تھا۔ پہاڑی چشموں کے پانی اور تازہ آب و ہوا نے اس کی صحت پر کافی اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ درختوں پہاڑوں سے اپنے دکھ بیان کرتا اور دل کھول کر رو لیتا تھا۔ سب اپنے تھے۔ شفاف ستاروں سے بھرا آسمان اور بہتے پانی۔

حاجی خان کے ہوٹل کے ٹی وی پر لگی خبریں بھی وہ سن لیتا۔ پچھلے دنوں سے تشویش ناک خبروں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کوئی جراثیم بلا بن کر دنیا پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ اُسے کورونا کہتے تھے۔ اسے یکدم رفیع اللہ کی فکر ہوئی۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور بیٹے کو فون کیا۔ جب اُسے یہ روح فرسا خبر

ملی کہ اس کا بیٹا کافی دنوں سے بخار اور کھانسی میں مبتلا ہے۔ تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ میری حبیبہ کی نشانی ہے اُسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اپنی تجربہ کار نگاہوں سے کوئی ایسی جڑی بوٹی تلاش کرنا چاہتا تھا جو اس جراثیم کو ختم کر دے وہ بہت سارا وقت جنگل میں گزارتا۔ نئی نئی بوٹیاں تلاش کرتا ان کا ست نکالتا اور اُن کو آزماتا وہ کیا کرے کیا کرے یہی سوچتا رہتا۔

اس نے آزمائی ہوئی دو تین بوٹیاں نکالی اور ان کی دوائیاں شروع کر دی۔ اللہ تو برکت ڈال میرا بیٹا ٹھیک ہو جائے۔ وہ رونے لگا۔ اس نے جلدی جلدی دوائی بنائی اس نے کچھ بیماروں پر آزمائی بھی مگر وہ کرونا کے مریض تو نہیں تھے مجھے اُسے اور سمجھنا چاہیے کہ یہ ہے کیا۔ اب وہ اکثر ہوٹل کے ٹی وی کو دیکھتا رہتا۔ اک بے قراری اس کے بدن میں لہریں لیتی رہتی۔ آہستہ آہستہ اُسے پتہ چلا کہ یہ ایک بخار کی قسم ہے جس میں شدید کھانسی دم گھونٹ دیتی ہے۔

کچھ کچھ سمجھ آئی تو اپنے حکیمی نسخے بہتر بنانے لگا۔ اللہ تو کہیں بھی کرم کر سکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے مجھے جانا چاہیے۔ وہ بس میں بیٹھا اور سیدھا پنڈی آ گیا۔ گھر پہنچا تو حیران رہ گیا۔ بہو تو ڈر ہی گئی۔ بابا جی آپ کیوں آ گئے۔ یاں تو موت کا راج ہے۔ آپ کیوں بیمار ہونا چاہتے ہیں۔

وہ رونے لگی۔ مجھے میرے بیٹے کے پاس لے چلو۔ آپ وہاں نہیں جا سکتے۔ کیوں نہیں جا سکتا۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ بابا انھیں قرنطینہ میں رکھا گیا ہے بہت دنوں سے بیمار ہیں ہمیں بھی ملنے کی اجازت نہیں۔

بہو میرا ملنا بہت ضروری ہے، اچھا میں آپ کو ایڈریس دے دیتی ہوں آپ جا کر خود دیکھ لیں، مگر پھر گھر نہ آیئے گا۔ آپ ضرور کورونا گھر لے آئیں گے۔ میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں وہ رونے لگی۔

بے فکر رہو میں اپنے بیٹے کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔

وہ قرنطینہ سینٹر پہنچا جہاں اس کا بیٹا وینٹی لیٹر پر تھا بہت مشکل سے سانس لے لیتا ہوا وہ ایک بزرگ سی نرس کے پاس پہنچا تو غالباً انچارج تھی۔ میرا بیٹا یہاں داخل ہے میں نے اُسے دیکھا ہے۔ کیا میں اُس کے پاس رہ سکتا ہوں۔ نہیں باباجی۔ ہرگز نہیں وہ کرونا کا مریض ہے۔ آپ تو پہلے ہی بوڑھے ہیں۔

میں ایک حکیم ہوں اور کالام میں سب مریضوں کا علاج کرتا ہوں۔ میں کچھ دوائی لے کر آیا ہوں اپنے بیٹے کو دینا چاہتا ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ایک سرکاری افسر ہے اور اس کے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ وہ میری (مرحومہ) بیوی کی ایک ہی نشانی ہے۔ باباجی یہ ممکن نہیں۔ دیکھو بہن اگر وہ وینٹی لیٹر پر مر جائے تو کیا یہ ٹھیک رہے گا۔ نرس حیران ہو گئی کیا کہا۔ اس نے یکدم مڑ کر بابا کو دیکھا۔

مجھے اسے بچانے دو وہ رو پڑا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح ہے کہ یہاں سارا دن ڈاکٹر گھومتے ہیں تم رات کو آنا ویسے بھی تمھارا بیٹا اب بچے گا نہیں وہ بے دردی سے بولی۔ بوڑھے کا دل کٹ کر رہ گیا وہ تڑپ اُٹھا ٹھیک ہے ایک موقع دے دو۔ میں آخری بار اپنی کوشش کرلوں۔ ٹھیک ہے، بعد میں بات کرتے ہیں بوڑھا چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا اور دعاؤں میں مشغول ہو گیا۔

بوڑھے سمیع اللہ کا پل پل قیامت کا گزر رہا تھا۔ دعائیں مانگ مانگ کر وہ تھک چکا تھا۔ میرے مالک ہماری خطا معاف کر دے۔ گناہ بخش یا رب، میرے بیٹے کو بچالے۔ وہ دکھوں کے گرداب میں گھرا ہوا ڈوب رہا تھا۔ گویا ایک ایک سانس اس پر بھاری گزر رہا تھا۔ جوان بہو دو چھوٹے بچے کیا ہوگا ان کا۔ بوڑھا سوچ کر ہی کانپ اُٹھا۔ کیا بنے گا آنسو بے دریغ بہنے لگے تھے۔ رات کے دس بج رہے تھے جب سسٹر نادیہ آتی دکھائی دی۔ میرے ساتھ آئیں۔ اس کے پاس ایک سفید اور آل بھی تھا یہ پہن لیں دوسرے لوگ متوجہ نہیں ہونگے۔ تمھارا شکریہ بہن۔ جیتی رہو۔ سمیع اللہ خان نے اور آل پہن لیا۔ عینک تو پہلے ہی اس نے پہن رکھی تھی ٹھیک ہے آؤ میرے ساتھ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بیٹے کے بیڈ تک پہنچا آکسیجن لگی ہوئی تھی اور وہ بے سدھ تھا سینے میں عجیب سی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ حوصلہ رکھیں لالہ، سسٹر تم آکسیجن کو ہٹاؤ تا کہ میں دوائی کے چند قطرے بیٹے کے منہ میں ٹپکا سکوں۔ وہ کرونا کا مریض ہے پہلے یہ گلوز پہن لو۔ اور ماسک کو درست کرو، مجھے بیٹے کے بغیر زندگی کی طلب نہیں ہے اُس سے حسرت سے کہا۔

سسٹر نادیہ نے پردہ آگے کر دیا۔ جیسے ہی آکسیجن ہٹی۔ رفیع لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ سمیع اللہ نے جلدی سے شیشی کا ڈھکن ہٹایا اور دوائی اپنے بیٹے کے منہ میں ڈال دی۔ چلو جلدی سے آکسیجن لگا دو۔ اللہ میرے بیٹے پر کرم کرے۔ وہ کتنی دیر نم آنکھوں کو صاف کرتا رہا۔ آکسیجن لگنے سے جیسے اس کا دل بہتر کام کرنے لگا تھا۔

میرا بیٹا جینا چاہتا ہے میرے اللہ۔ اُسے لمبی زندگی دے، چلیں باہر چلیں کوئی ڈاکٹر آ گیا تو مسئلہ بنے گا۔ ہاں چلو، وہ ایک نظر بیٹے کو دیکھ کر باہر آ گیا۔ سنو بھائی میری ڈیوٹی ختم ہوگئی یہ میری جگہ ایک اور سسٹر آجائے گی میں اُسے آپ کا بتادوں گی۔ شکریہ بہن۔ وہ ہسپتال کے شیڈ کے نیچے چادر بچھا کر بیٹھ گیا۔ کچھ کھانے پینے کا من نہیں تھا فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بہو کا فون تھا وہ رفیع اللہ کا حال پوچھ رہی تھی۔ بس دعا کرو بیٹی اللہ کرم کرے گا۔ تم بچوں کو سنبھالو میں یہیں رہوں گا۔ جب تک بیٹا ٹھیک نہ ہو جائے۔ اپنا خیال رکھنا بابا، ہاں ہاں فکر نہ کرو۔ آپ نے کچھ کھایا ہے۔ دل نہیں چاہتا بھوک لگے گی تو کچھ کھالوں گا۔ پیسے ہیں میرے پاس

تم بچوں کو سنبھالو۔ ٹھیک ہے بابا، فون بند کر کے بابا پھر سے دل کے رابطے رب سے جوڑنے لگا رات نہ جانے کس پہر آنکھ لگی۔

رات خواب میں بیٹے کے ساتھ پہاڑوں میں بھاگتا اور ندیاں پھلانگتا رہا کہیں چشمے تھے کہیں آبشاریں تھیں۔

صبح ہی صبح وہ اُٹھ کر بیٹے کے بیڈ کے پاس پہنچا وہ سکون سے سو رہا تھا۔ سینے کی کھڑکھڑاہٹ کم تھی۔ بابا کو خوشی ہوئی۔ اللہ نے میری سن لی ہے۔ وہ سسٹر کا انتظار کرتا رہا۔ وہ دوائی کے چند اور قطرے بیٹے کو پلانا چاہتا تھا۔ پہلی شام کی طرح اگلی شام بھی اُس نے سسٹر نادیہ کی مدد سے آکسیجن ماسک اُتارا تو آج صورت حال بہتر تھی۔ سسٹر خوش ہوئی اس نے پھر جلدی سے بیٹے کو دوائی پلائی اور باہر آ گیا۔

سسٹر نادیہ حیران تھی اتنا کریٹکل مریض اب پہلے سے بہتر نظر آتا تھا۔ دوائی کی تیسری خوراک لینے کے بعد اُس نے آکسیجن اتارنے کا کہا۔ میں اب بہتر ہوں۔ میرے بابا کو بلاؤ۔ اور سسٹر نادیہ بھاگی ہوئی بابا کے پاس پہنچی۔ بابا، تمھارا بیٹا بلاتا ہے۔

سمیع اللہ مسکرایا وہ جلدی سے بیٹے کے پاس پہنچا وہ ماسک اتار کر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ بابا، رفیع اللہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ بابا کی جان سمیع اللہ تیزی سے آگے بڑھا۔ بابا احتیاط کریں میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔ میں بھی، بابا کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

بابا کونسی دوائی پلائی تھی مجھے۔ میرے اللہ نے شفا دی ہے کچھ روز اور گزرے۔ آج وہ بیٹے کو لے کر گھر جا رہا تھا۔ سسٹر نادیہ نے آتے ہی کہا۔ بابا وہ دوائی مجھے دے دیں تا کہ مرتے ہوئے مریضوں کی جان بچائی جا سکے۔

بابا سمیع مسکرایا۔ سسٹر وہ تو محض کھانسی اور دمہ کی دوائی ہے۔ یہ تو میرے یقین اور ایمان نے میرے بچے کو بچایا ہے۔ بابا میں بھی یقین رکھتی ہوں۔ مجھے یہ دوائی دے دو۔ بابا نے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر سسٹر نادیہ کو دے دی۔

سسٹر ادیہ نے سب کے سامنے وہ دوائی پی لی۔ بہن تم نے پی لی۔ بابا مجھے بھی کرونا ہو گیا ہے۔ اور میں بھی مرنا نہیں چاہتی۔ تم حوصلے والی خاتون ہو ٹھیک ہو جاؤ گی۔ سمیع اللہ بھائی خود بھی پی لینا۔ بابا نے دوا اور شیشیاں اس کے حوالے کر دیں۔ تمھارا یقین تمھیں بچا لے گا۔ اپنی طبیعت کا بتاتے رہنا تمھارا یہ بھائی تمھاری خبر رکھے گا۔ شکریہ بھائی۔

سسٹر نادیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بابا سمیع اللہ بیٹے کو لے کر گھر پہنچا۔ بہو نے دروازہ کھولا اور حیران رہ گئی۔ ہم دونوں ٹھیک ہیں بیٹے، بابا نے پیار سے بہو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے کہا تھا نہ اپنے بیٹے کو لے کر آؤں گا۔ ہاں اور میں نے وہ دوائی سسٹر نادیہ کو دے دی۔ اللہ اُسے زندگی دے بوڑھے کی واپسی بڑی شاندار تھی۔ وہ بالآخر بیٹے کو قرنطینہ سے واپس لے آیا تھا۔

☆☆☆☆☆

ریچھ.....

------ ریچھ کی قلابازیاں ہر جانے آنے والے کو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں--- اس کے پاؤں میں گھنگرو بھی بندھے تھے جن کی جھنکار توجہ کو مہمیز کر رہی تھی---- ریچھ اچھل اچھل کر کرتب دکھا رہا تھا--- تماش بین کبھی خوشی سے تالیاں بجاتے اور کبھی ریچھ کی جولانیوں سے ڈر کر دو قدم پیچھے بھی ہٹ جاتے تھے--- تاہم وہ بے خوف تھے کیونکہ- ریچھ کے دانت نکالے جا چکے تھے ----- تماشا دکھانے والا اپنے مخصوص چغے میں ریچھ کی طاقت ور رسی سے اسے کنٹرول کرتا اور تماش بینوں سے پیسے بٹورتا جا رہا تھا--- اسے ریچھ کو ہدایات دینے کا فن پوری طرح آتا تھا اور ریچھ بھی اسے مکمل سمجھ رہا تھا--- دونوں کو یقین تھا کہ وہ اپنے اپنے شعبے میں حسن کارکردگی کا صدارتی تمغہ جیتنے میں کامیاب ہو جائیں گے---- یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریچھ سڑکوں پر ناچتے تھے- آج کل اہم مقامات پر ناچتے ہیں اور ٹیکنالوجی کی مدد سے نت نئے تماشے کرتے ہیں ------

ان دنوں ابھی امپرومنٹ نہیں ہوئی تھی--- بچے، بوڑھے اور جوان بے فکر ہو کر میدانوں میں ریچھ کے تماشے دیکھتے تھے اور اس کے شعبدوں پر خوش ہو کے سکے اچھالنا اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے تھے--- بچیاں بھی اس وقت ریچھ سے نہیں ڈرتی تھیں----، خواہ انہوں نے چھوٹی چھوٹی فراکیں ہی کیوں نہ پہن رکھی ہوں---یا سکول سے پیدل گھر واپس آ رہی ہوں اور راستے میں ریچھ تماشا دیکھنے میں لگ گئی ہوں--- تاخیر کے باوجود اپنے گھر پہنچ جانا ان کے مقدر میں لکھا ہوا تھا---

شاید یہی اعتماد تھا کہ بچیاں چھوٹے

فرخندہ شمیم

چھوٹے کپڑوں میں بھی کھیلتی رہتی تھیں---انہی بچیوں میں سے ایک ریچھ کے ساتھ بہت مانوس ہو گئی تھی---اسے ریچھ کے ساتھ دوستی کا شوق ہو گیا اور وہ اپنی پاکٹ منی سے پیسے بچا بچا کر ریچھ کے لئے کھانے پینے کی چیزیں خریدتی اور سکول کے راستے میں پڑنے والے چڑیا گھر میں ریچھ کے پنجرے کے پاس رک کر اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی -، ریچھ بھی گویا اس کی باتوں کا جواب دیتا تھا- بچی چاچا چڑیا گھر سے پوچھ چکی تھی کہ ریچھ کے دانت تو نہیں ہیں---چاچا نے اسے تسلی کرا دی تھی کہ ریچھ سدھایا ہوا ہے اور بے ضرر ہے-----ویسے بھی وہ قیدی ہے اور پنجرہ مکیں میں جرات نہیں ہوتی، یہ تماشے تو آزاد منش کرتے ہیں----بچی ریچھ کے پنجرے میں کھانے پینے کی چیزیں ڈالتی اور واپس آ جاتی چڑیا گھر کا ملازم بچی اور ریچھ کی اس عجیب رفاقت پر حیران رہ جاتا---تاہم وہ یہ ضرور چیک کرتا تھا کہ بچی ریچھ کو کیا کھلا رہی ہے---یہ دیکھنا اس کی ڈیوٹی جو تھی ---- تعجب کی بات نہیں، ایسا ایک زمانے میں ہوتا بھی تھا---اور پھر ابھی اتنا زمانہ بھی کہاں گزرا ہے---ٹیکنالوجی سے ذرا پہلے تک- کا تو قصہ ہے یہ!

نئے ہزاریے نے دراصل بہت سی سہولتیں پیدا کر دی ہیں---بحر منجمد شالی بحر منجمد جنوبی کے ساتھ کھڑے کھڑے باتیں کر لیتا ہے، کون شخص کس ملک میں کون سے رنگ کے کپڑے پہنے کہاں گھوم رہا ہے، یہ بھی پتہ چل جاتا ہے، بس اس ملک میں اپنی ایجنسی کا ہونا ضروری ہے--جو ٹارگٹ کا اس طرح پیچھا کر سکے جس طرح کوئی کتا کسی بوٹی کا تعاقب کرتا ہے---

ٹیکنالوجی میں یہ ایک عام بات ہے کہ کسی کا منہ اور کسی کا ننگا بدن اٹھا کر پتوں سے جوڑ دیا جائے اور پھر خوب پیسے کمائے جائیں----وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں ہے کہ برمودا مثلث کا سارا نحس بحری کپتانوں کی عیاشی کا روپ لے لے اور جہاز کے عرشے ماتم کرنا چھوڑ دیں-----

ٹیکنالوجی نے بہت سی حیرتیں پیدا کر دی ہیں، لیکن معصومیت حیرانیوں سے پاک ہوتی ہے---وہ تو بس سکول سے گھر اور یا کبھی راستے میں چڑیا گھر کے جانوروں سے ملنے چلی جاتی ہے---اکیلی بھی ہو تو بے خوف ہوتی ہے، سکول وین کے ڈرائیور انکل اور چڑیا گھر کے چاچا زو ZOO اس کی حفاظت کرتے ہیں، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اس کے گالوں کو پیار سے چھو لیتے ہیں ----- لیکن - -، اس

روز؟ یہ کیا
روڈ میپ میں اچانک تبدیلی لائی گئی ---یہ حکومت کی طرف سے نہیں تھی، بس ریاست کے اندر ریاست بنانا ایک معمول بن چکا تھا---- سیاست اور مذہب ایک پیج پر نہیں آ رہے تھے اور لاٹھیاں تیار کی جارہی تھیں------
ویگن ڈرائیور نے بتایا کہ شہر میں دھرنا ہے ،پہلے اس بچی کو اور بعد میں باقی بچوں کو سکول پہنچائے گا---ورنہ دوسرے بچے بھی لیٹ ہو جائیں گے------ کچی آبادیوں میں رہنے والوں کو ایسی قربانیاں اکثر دینی پڑتی ہیں حالانکہ ان کے شناختی کارڈ کا رنگ کوئی علیحدہ نہیں ہے-----
تمام بچے ایک ایک کر کے اپنے اپنے سکول میں اتار دیے گئے مگر، چھوٹی بچی وین میں اونگھتی رہی---ڈرائیور انکل نے ونڈسکرین میں دیکھ کر تسلی کر لی تھی، وہ مسلسل نیند میں ہے----بے خوابی کے ان لمحوں میں بچی صرف اتنا جان سکی ڈرائیور انکل آج دانتوں والے ریچھ بنے ہوئے ہیں----
جس نے اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کا بستہ اڑا دیا ہے
زلزلے نے پوری بستی کی بنیاد ہلا دی۔
کچی بستیوں میں صف ماتم پر ننھا لاشہ پڑا تھا۔
ڈرائیور بھاگ گیا اور ایک پیج پر آنے کی جدوجہد کرنے والے بے خبر رہے- بچی کے گھر میں ایک تاسا تھا مخلوق کا جو بندھا ہوا تھا--اس- کی ماں ہیجان میں تھی، بے جان بچی کا نچڑا ہوا چہرہ نامحرموں سے چھپانے کی وحشت میں بار بار اپنا دوپٹہ بدل رہی تھی ---لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے----
انہوں نے فیصلہ کیا ایک بیوہ ماں کو انصاف دلانے کے لیے ایوانوں کے دروازے کھٹکھٹائیں گے-----بچی کا لاشہ مختلف چوراہوں سے گزارتے، نوحے کرتے وہ ایوانوں تک پہنچ گئے اور خوب چلائے، عمارت خاموش رہی---اس کے اندر کوئی حرکت نہیں ہوئی--- سکیورٹی کو ڈسپلن کا حکم دیدیا گیا--- آدھی نفری توڑی چوک پر تھی، وہاں ایک پیج کا فساد چل رہا تھا، مظلوم بستی اتنا اہم معاملہ نہیں تھا-- نقص امن کی خلاف ورزی کی دفعہ لگ گئی دار الحکومت کے راستے گلی ڈنڈا کھیلنے کیلئے نہیں ہوتے، ایوان کے سامنے سے تو جنازہ بھی نہیں گزر جا سکتا ہے--لاٹھیاں چل پڑیں--- مجمع بکھر گیا، لاشہ بین کرنے لگا، گرفتاریاں شروع ہو گئیں لیکن ایوانوں کے اندر سے فقط پھوکے غباروں کی سی آواز آئی، جیسے سڑکوں پر بغیر دانت کے ناچنے والے ریچھ عمارت میں گھنگرو بجا رہے ہوں۔

☆☆☆☆☆

دروج

بہتے ہوئے خون سے شہر میں زنگ سا لگ گیا تھا- کبھی دھماکہ کبھی گولی چاٹ جاتی- ہم تو جیسے تیسے زندگی بھوگ ہی رہے تھے مگر طارق کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا- اسے ہسپتال میں داخل کرانا پڑا کچھ روز بعد وہ سنبھل سا گیا- ڈاکٹروں نے حساسیت کم کرنے کے لیے اسے گولیوں پر رکھ دیا- ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ دماغی کام نہ کرے- اس کے والد ایوب ٹھیکیدار کینٹ میں کام کرتے تھے- یہ وہ دنیا ہے جہاں غم کی کوئی رات نہیں- کبھی مسیحی قبرستان کی دیواریں گرا کر نئی دیواروں کا ٹھیکہ ملتا، کبھی دیواروں پہ دلکش جھروکے بھی رکھے جاتے جیسے صلیبوں کی دنیا سے نکل کر روحیں کینٹ میں دہشت گردی نہ کریں کبھی یہ بڑا سا مینار بناتے پھر توڑ کر نیا بنواتے- کبھی ایک حسین پارک بناتے- غرضیکہ سارا سال کام چلتا رہتا- ٹھیکیداری میں تو یوں بھی دماغ کی نہیں تعلقات کی ضرورت ہوا کرتی ہے، مگر جانے کیوں طارق کی حساسیت بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی- قتل و غارت، افراد کا اغوا اور پھر غائب کر دیا جانا- مسخ شدہ لاشوں کا ملنا، وہ تڑپ تڑپ اُٹھتا- سبھی دوست اسے سمجھاتے کہ یہی تو تاریخ انسانی ہے- گبن نے لکھا تھا کہ انسانی جرائم کے اندراج کا نام ہی تاریخ ہے- مگر وہ چونکہ کم پڑھا لکھا تھا- بیکل ہو جاتا دکھی ہو کر تڑپنے لگتا- کبھی ہم بغداد میں جو مسلمانوں کے سر کاٹ کر اہرام بنائے گئے تھے یاد دلاتے اور کبھی دہلی کا قتل عام پھر بٹوارے کی کہانیاں مگر اس مرد ناداں پہ کلام ضائع جاتا- ٹھیکیداری چونکہ منشیوں کے ذریعے ہی چلتی اسے خاصہ وقت سوچنے کے لیے ملتا- ہم نے اس کے والد کو مشورہ دیا کہ طارق کو حساب کتاب پہ بھی لگایا جائے تاکہ لاشوں کا حساب رکھنے کے بجائے روپے پیسے کے اعداد کی بھول بھلیوں میں ہی الجھ کر رہ جائے- دوائیوں سے طارق کو خاصہ افاقہ ہوا- اس کی باریک

آغا گل

بنی تکلہ سنجی میں بھی فرق آیا اور بقول اس کے سر کچھ بوجھل سا رہنا لگا تھا "سر کچھ بھاری سا لگتا ہے۔"

دوست بہت خوش ہوئے "شکر ہے کہ پاؤں بھاری نہیں ہوا۔" محاور اس کے سر سے گزر گیا۔ وہ اکثر دوستوں کے دفتروں میں چلا آتا، یا پھر شام کے کھانے پہ مدعو کرتا۔ اس کے والد کا قول تھا کہ ایک کامیاب ٹھیکدار کو دعوتیں بکثرت کرنی چاہیں۔ یہی نہیں بلکہ اڑک میں ایک باغ خرید کر مہمان خانہ بھی بنوا ڈالا۔ تاکہ دعوتوں میں سہولت رہے، کیونکہ اعلیٰ افسر پیٹ سے سوچتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے شادی کا بھی مشورہ دیا تھا کہ ارسطو کی دونوں بیویوں نے اسے بھی چکرا دیا تھا۔ اگر اس کی چار شادیاں کرا دی جائیں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ پنجاب میں دولہا خریدا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں دلہن اور ایوب کے پاس تو دولت کی کمی نہ تھی طارق کو فلمیں بھی مار دھاڑ والی ہی پسند تھیں۔ یوں تو وہ ایک وجیہہ جوان تھا، بس آنکھیں کچھ شرمیلی سی تھیں جیسے کسی شرمیلی کی آنکھیں اسے جڑ دی ہوں اس چہرے پر وہ آنکھیں نہ جچتیں۔ شاید اسی لیے دکھی دکھی سا رہتا۔ جیسے سارے شہر کا وہی گورکن رہا ہو۔ ابھی ہم اسے محبت کی دنیا میں دھکیلنے کی کوشش میں ہی تھے کہ خود ہی کود پڑا، جذباتی تو سفینوں میں بھی ڈوب جاتے ہیں۔ شام میں ہم دونوں گولڈ سٹی کافی پینے جایا کرتے، حسینوں کے لشکر وہاں مارتے کاٹتے پھرتے نہ تو ان پر دفعہ 144 لگی اور نہ ہی کوئی ہاتھ روکتا، جگر کو قوت اور آنکھوں کو طراوت ملتی۔ سیڑھیوں پہ اچانک ہی ایک حسینہ کا پرس اس سے ٹکرا کر تین چار سیڑھیاں نیچے جا گرا۔ ملکوتی حسن نے قہر بھری نظروں سے طارق کو دیکھا تو وہ لڑکھڑا کر مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں گرفت میں نہ لیتا تو وہ شاید پرس سے بھی دور جا گرتا اس قاتلہ نے جو طارق کے ہوش اڑتے دیکھے تو شعلہ فشاں سورج کے بجائے مسکراہٹ میں بھیگ گئی ویسے بھی لگا خود ہی جھلاتی آ رہی تھی اور دے مارا۔ اچانک دلسورہ کا چاند بن گئی۔ یوں پلک جھپکتے چلتا چہار غاش پل بھر میں ایک تباہ" کن مسکراہٹ میں منقلب ہو گیا۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی کسی لانگ ویک اینڈ پہ جنم لیا ہوگا۔ خالق نے بھی اسے بنانے میں اڑھائی دن تو لیے ہی ہوں گے۔ مسکراہٹ سے دھلا چہرہ ہنسی روکنے کی کوششیں بھی گوارخ کا دل رہا گلدستہ بن گیا شگرف سا مگر اب چہرے پہ جمال نہ تھا۔ جمال بکھر گیا تھا۔

"اپنے آپ کو تو سنبھالیں کبھی پرس کو ٹکر مارتے ہیں۔ کبھی خود ہی گرنے لگتے ہیں۔" مترنم آواز آئی۔ طارق نے خود کو سنبھالا اتفاقاً لوگ بھی کم تھے۔ اس نے پرس کی چیزیں سمیٹ کر دوبارہ پرس اسے پیش کیا۔ "آپ کیا سزا دینا چاہیں گی؟ کیا

جرمانہ نافذ کریں گی؟'' طارق التجا پہ اتر آیا تھا۔

''کچھ نہیں، بس فکریں نہ مارا کریں راہ چلتوں کو'' اسنے برسٹ مارا ہماری منت سماجت پہ وہ ریسورنٹ میں کچھ لینے کے لیے آمادہ ہوگئی۔ ساتھ ہی اس کی چھوٹی بہن تھی، مگر وہ ممنوعہ بور کی نہ تھی عام سی لڑکی تھی۔ البتہ مولڈ دونوں کا ایک ہی سا تھا۔

''ویسے وقت تو کھانے کا ہے۔'' طارق اب دھرنا دے چکا تھا۔ اس نے سوپ کا آرڈر دیا۔ پھر میری جانب متوجہ ہوا۔

''تم ذرا اپنا مریض دیکھ آؤ تمھیں دیر ہو رہی ہے۔ رات کو بات کرتے ہیں۔'' میرا جی تو چاہا کہ پانی کی بوتل اُٹھا کر طارق کے سر پہ ماروں، مگر وہ پلاسٹک کی تھی۔ پھر وہ تھا بھی ذہنی دباؤ میں ہم اسے جس مقتل میں دھکیلنا چاہتے تھے وہ خود ہی اس میں اُتر چکا ہے۔ میں نے اس حسن مجسم کو نگاہوں کے لیزر سے فوکس کیا اور جتنا حسن سمیٹ سکتا تھا دل میں اتار کر اجازت لیتا ہوا باہر نکل گیا۔ جیسے اجنتا کی مورت باہر نکل آئی ہو چادری پہنے۔ اگلے روز دفتر چلا آیا بڑی ہی معذرت کی۔ میں غصے میں لاتعلقی سے چائے پیتا رہا تو اس نے خود ہی بڑھ کر گلے لگا لیا۔

''تمہارے والد تو فوت ہو چکے ہیں؟'' طارق نے سوال کیا۔ اس احمقانہ سوال پہ مجھے حیرت بھی ہوئی۔

''لگتا ہے وہ تمہارے ہوش کے علاوہ یاداشت بھی اپنے پرس میں ڈال کر چلتی بنی۔ تم فاتحہ میں بھی تو شامل تھے۔'' ''میں نے اسے غور سے دیکھا۔ عشق میں بہت سے لوگ مجنوں بن چکے تھے۔ ''ہاں!'' طارق چہکا ''یاد ہے آج میں نے تینوں کو رات کے کھانے پہ بلایا ہے۔ ضرور آنا جی بھی ہو گی لانڈی بھی'' یہ سن کر میرا غصہ جاتا رہا ''یہ دعوت ہے یا کہ خیرات؟'' ہمارے ہاں ڈرنگ ساتھ ہو تو دعوت کہا جاتا ہے ورنہ خیرات۔ طارق نے اُٹھتے ہوئے یقین دلایا کہ رات کی دعوت ہے۔

رات کو کھانے پہ سبھی دوست بہکے ہوئے جلد سے جلد اس پرس والی کی کہانی سننا چاہتے تھے۔ طارق نے بتلایا کہ اس کا نام دروج ہے، بی ایس کرنے کے بعد گھر میں ہی شوقیہ پینٹنگ کرتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اس محبت کے زینے سے وہ تصوف کی ساری ہی منازل طے کرنا چاہتا تھا۔ ہمیں خوشی بھی ہوئی اور قدرے تشویش بھی کہ کہیں بالکل ہی لیوانہ بن کر دروج کے لیے چاک گریبان ہی نہ بھرنے لگے۔ مگر وہ بہت خوش تھا قہقہے لگا رہا تھا زندہ دل زندگی لوٹ آئی تھی اس خون اگلے تذبذب میں ڈوبے شہر سے نکل کر طارق بیرونی دنیا سے کٹ سا گیا تھا۔ ہمیں بتایا کہ اخبار بند کر کے وہ خبریں بھی نہ سنتا۔ ہم اسے کسی کی ٹارگیٹ کی خبر سناتے یا جو پوچھ گچھ لیے اُٹھائے جاتے تو وہ سنی ان سنی کر دیتا۔ البتہ اس کے لباس

میں قرینہ آ گیا تھا۔
اس کا ساتھی موبائل تھا جو اسے پرس والی سے ملائے رکھتا۔ اس کا جنوں ایسا بڑھا کہ دوستوں میں بھی بیٹھ کر موبائل پہ میسجنگ کرتا رہتا۔ دوست ٹوکتے کہ تم ہم سے منے آئے ہو یا میسجنگ کرنے۔ اس نے پرس والی کی بہت سی تصویریں بھی موبائل میں محفوظ کر لی تھیں، کزخصہ میں کبھی سپین کاریز کے ساتھ تو کہیں Windy corner میں جہاں شوریدہ سر ہوائیں دروج کا لباس اتارنے لگتیں، اس کی حسین زلفیں چلتن کے ناگوں سی لہرانے لگتیں۔ ہم نے اسے آگاہ بھی کیا کہ موبائل ہی محبت کرنے والوں کا دشمن بھی ہے۔ پہلے تو کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوتی۔ کوئی پکڑی بھی جاتی تو جھوٹی قسم کھا کے بچ جاتی۔ مگر اب تو ایک ایک منٹ کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ موبائل کی تصویریں ڈی لیٹ بھی کر دیں تو وہ مین سرور میں کہیں، محفوظ رہتی ہیں۔ سرکار کے تمام ریکارڈ محفوظ رکھتی ہے۔ طارق اس تنبیہہ پر خفا ہوا ''تو کیا مجھے ملٹری کورٹ محبت کرنے کے جرم میں کوڑوں کی سزا دے گی۔ محبت ناقابل دست اندازی پولیس ایک عمل ہے ورنہ تو دنیا کے بڑے عاشقوں کو عمر قید بول دیتے۔''

ایک بار اتفاقاً ہی کسی دعوت پر سیکاٹرسٹ سے ملاقات ہو گئی۔ اس کا وقت یوں تو بکاؤ ہوتا ہے۔ دو سو سے زیادہ مریض دن میں دیکھتے ہیں مگر دعوت کے باعث وہ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور مہمانوں کو بھی شکاری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ممکنہ مریض کون ہو سکتا ہے۔ مہنگائی عدم تحفظ سرکاری دباؤ حکومت کے لڑکھڑاتے قدم جن سے وہ عوام کا جنازہ لیے جا رہی تھی۔ سرکار بھی کیا گل کیے دے رہی تھی۔ میں نے طارق کے دھانسو عشق کا بتلایا کہ اب وہ غموں کی دنیا یا پھر حقیقی دنیا سے کٹ کر پرس والی کے پرس میں کنڈلی مار کے آ بیٹھا ہے۔ شاید وہ لڑکی سیپرن ہے کہ اچھے بھلے ہمارے دوست کو بس میں کر لیا۔ ڈاکٹر خوش ہونے کے بجائے بے حد ناخوش ہوا۔ ''ہارٹ یا سیکاٹری کا مریض اپنی قوت ارادی کے بس پر دوا نہیں چھوڑ سکتا وہ تو OCDS کا مریض ہے۔ یہ عشق اس کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اسے کہنا مجھ سے ملے'' پھر خود ہی مسکرا اُٹھا ''فیس نہیں لوں گا۔ ہمارے ملک کا نام پاگلستان ہونے کو ہے۔''

طارق نے میری بات ہنسی میں اُڑا دی۔''
میں نے اپنے گرد ایک دائرہ ڈال دیا ہے، جس میں پرس والی اور میں ہوں، باقی کوئی جیئے مرے مجھے کیا۔ جنھیں ریاست اغوا نہیں کرتی وہ بھی تو مر جاتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ تو کرونا کی وا سے مرتے جا رہے ہیں۔ میں نہیں ملوں گا۔ مجھے تو وہ ڈاکٹر بھی پاگل سا لگتا ہے۔''

میں ڈاکٹر کی رائے کو اہمیت دے رہا تھا۔
''اس دوائی کا کیا کیا؟''

طارق نے قہقہہ لگایا ''پرس والی نے وہ ساری گولیاں پیر پنجہ کے چشمے کے پاس پھینک دی تھیں۔ چونکہ بیوی کا نام نہیں لیا جاتا۔ اسے فیملی یا گھر والے کہا جاتا ہے طارق بھی اپنے خاندان کا وقار قرار دیتے ہوئے اسے دوروج کے بجائے پرس والی ہی کہا کرتا۔

ہم اکثر انہیں کے ساتھ ساتھ گھومتے پھرتے دیکھتے۔ کہیں کھانا کھاتے کہیں جوس پیتے۔ اس چھوٹے سے شہر میں ریسٹورنٹ ہی کتنے تھے۔ طارق جب دوستوں کے ہاں آتا تو بھی اسکا موبائل اس کی جان نہ چھوڑتا کمبخت کسی جاسوس کی طرح دم مارنے نہ دیتا۔ جہاں کہیں سگنل نہ ہوتے طارق ان علاقوں میں ساتھ جانے سے انکار کر دیتا۔ پہاڑی سلسلوں کے باعث اکثر جگہ موبائل کے سگنل ہی نہ آتے اسے تو گویا موبائل سے موذت ہوگئی تھی۔ جس کے بنا اس کا جینا ہی مشکل تھا۔ اس کے سانس بند ہونے لگے، عجیب سے ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا۔ طارق کے گھر والے بار بار رشتہ مانگنے گئے، وہ بھی دعوتوں پہ چلے آئے۔ دروج ان کی بہو کا درجہ رکھتی اگر ابتک منگنی بھی نہیں ہوئی تھی۔ طارق اسے تحفوں کی بارش میں بہا کر لے جانا چاہتا تھا۔ اب وہ ٹھیکیداری کو بھی کم ہی توجہ دیتا۔ ایک پرل وہائٹ گرینڈ بھی خرید لی۔ بڑے شاہانہ ٹھاٹ تھے امیر زادوں والے۔ دروج تو ہم زاد کی طرح ساتھ ساتھ ہی رہتی۔ دروج کو چراغ کا جن جو مل گیا تھا۔ پھر ان کے تعلقات کشیدہ ہونے لگے، دروج پہ ایک سرمایہ دار لٹو ہو گیا۔ جیسے سبی پہ اچانک ہی ریل کو نیا انجن آ لگتا ہے۔ دروج نے ایک نئے مرد کی رفاقت قبول کر لی۔ طارق میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرتا۔ وہ دروج پہ ہی برس پڑا۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں، زندگی بھر کرتی ہی رہوں گی۔'' دروج نے طارق کو یقین دلایا۔ جس پہ طارق بھڑک اُٹھا۔

''میں روح کا حاکم بنا رہوں، محبت کی معراج پہ اکیلا اور جسم کسی کی ملکیت ہو۔ تم کیا محبت کو جسم سے الگ کر سکتی ہو؟''

دروج بھلا ہار ماننے والی کب تھی ''جسم کی بات ہے تو لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ مجھ میں ایسی عجیب بات کیا ہے۔ زندگی بھر محبت کرتی رہوں گی۔ دروج تو اس جسم کا نام ہے جو ماں باپ نے دیا روح تو تمھاری ہے۔''

طارق بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا ''یعنی چھپ چھپا کر ملو گی؟''

دروج نے فیصلہ سنا دیا۔ ''نہیں میں دو آدمیوں کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ یہ ساری باتیں طارق نے ہی مجھے خود بتائیں دروج کی طرح ہاتھ نچا کر بھی دکھایا۔ وہ ٹن سا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اسٹاف نہ دیکھ لے ورنہ مفت کا الزام لگے گا کہ دفتر میں پی پلا کر لوگ آتے ہیں۔ یونین بھی پمفلٹ نکال

دے گی۔ میں طارق کو شہر سے باہر لے گیا۔ ہم کھانا کھا کے لوٹے تو میں نے اسے سیکاٹرسٹ کے پاس لے جانا چاہا۔ مگر اس نے انکار کر دیا "اب بہت دیر ہو گئی، مجھے تو اب ضرورت ہی نہیں رہی۔" چونکہ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ میں بھی ہنس کے ٹال گیا۔ ایک قوم والے سے طارق ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔ طارق نے فیصلہ سنایا "محبت کا اظہار بہادری نہیں۔ اس کا حصول بہادری ہے، تم جانتے ہو کہ ہٹلر اور نپولین جیسے ہار گئے سبھاش چندر بوس ہار کر گمنامی میں چلے گئے۔ بالکل روپوش ہی ہو گئے، اپنی شکست تسلیم کرنا مردوں کا ہی کام ہے۔" مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ تھی میں نے بھی موضوع بدل دیا۔ ہمارے اصرار کے باوجود وہ سیکاٹرسٹ کے پاس جانے پہ آمادہ نہ ہوا۔ اور نہ ہی وہ کوئی بچہ تھا کہ ہم گود میں اُٹھا کر لے جاتے۔

چند روز بعد میں ملنے گیا تو وہ قدرے نارمل تھا، مگر باتیں کرتے ہوئے پٹڑی سے اُتر جاتا۔ وہ ابنگ دروج میں ڈوبا من کے کوہ مراد میں اسے تلاشتا "میں پرس والی کو ایک قیمتی تحفہ دوں گا شادی کا۔" طارق نے فیصلہ سنایا "اور یہ تحفہ تم پہنچاؤ گے وعدہ کرو۔" میں نے ہاتھ ملا کر وعدہ کیا "تم جانتے ہو تمھارے رقیب کا باپ سیاسی آدمی ہے، ہر ایک حکومت میں اس نے دولت بنائی، تھائی لینڈ اور دوبئی میں ہوٹل خرید لیے۔ اس سے زیادہ قیمتی تحفہ تم دے سکو گے؟ کیا یہ گرینڈ اسے دو گے۔" طارق کا اعتماد بحال تھا۔ "تم دیکھنا ایسا قیمتی تحفہ اسے کوئی بھی نہ دے سکتا، پہنچاؤ گے تو اعتراف کرو گے مان جاؤ گے میری دریا دلی بلکہ بے جگری۔ قیمتی تحفے دل والے ہی دیا کرتے ہیں طارق ہی کے کہنے پہ میں نے دروج سے موبائل پہ رابطہ کیا، پہلے میسج کیا کہ طارق کا دوست ہوں میری کال اُٹھاؤ، بڑے اچھے طریقے سے پیش آئی۔ وہ جانتی تھی کہ میں طارق کا سب سے عزیز دوست ہوں۔

"طارق نے آپ کی اجرک مانگی ہے جو بی بی نانی مزار پہ اس نے آپ پہ ڈالی تھی وہ میں آپ سے لینے آؤں گا۔" کچھ دیر ساکت بھی رہی۔ دروج اس مطالبے پہ سخت حیران ہوئی "میں آپ کا نمبر سیو کر رہی ہوں، کل گولڈسٹی کے ریسٹورانٹ میں میری چھوٹی بہن آپ کو چادر پہنچا دے گی، اور جو زیور وغیرہ بھی دیئے تھے۔ وہ بھی واپس کر دوں؟" وہ فراخدلی سے بولی۔ گولکنڈہ کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ پورا فیسن ہی اسکا تھا 'جی نہیں صرف چادری' شادی کے باعث دروج نے کہیں آنا جانا موقوف کر دیا تھا۔ اس کی بہن نے وقت مقررہ پہ شاپر میں بند چادری مجھے پہنچا دی اور پھر بغیر کچھ لیے وہ اجنبی انداز میں واپس چلی گئی۔ میں حیرت سے شاپر دیکھتا رہا۔ کمال ہے

صرف چادری! میں فوراً ہی طارق کے ہاں پہنچا۔ وہ بے چینی سے میری ہی راہ دیکھ رہا تھا اس نے چادری نکالی اُسے سونگھا اور چہرے پہ لگا لیا مزید بدحواسیوں کو دیکھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ میں واپس چلا آیا۔

اگلی سہ پہر موبائل چیخ اُٹھا طارق کی تصویر سکرین پہ اُبھرنے لگی ''میں نے وعدہ کیا تھا کہ پرس والی کو ایک قیمتی تحفہ دوں گا جو تم اُسے پہنچاؤ گے۔'' یوں لگتا تھا کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بول رہا ہے۔ میں اپنے خون میں رنگ کر دوں گا، بس یہ اسے پہنچا دینا یہ اس کی شادی کا تحفہ ہے، میں ہار چکا ہوں۔'' میں ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، وہ لڑکی کوئی پتھالوجسٹ تو ہے نہیں۔ میں اسے بلڈ بینک سے تمھارے ہی گروپ کی پوری بوتل لگا دوں گا، مرغی کا خون لگا دوں گا۔ چادری کو میں خون لگا دوں گا۔''

طارق خوف ناک ہنسی ہنسا۔ ''محبت میں دھوکہ نہیں ہوتا اور پھر میرے خون سے ہی تو تحفہ انمول ہوگا۔ میں اپنی جان ہی تحفے میں دے ڈالوں گا۔ خدا حافظ اپنا وعدہ نبھانا ورنہ روزِ محشر تمھارا گریباں ہوگا اور میرا ہاتھ۔'' موبائل بند ہو گیا۔ ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر میں ننگے پاؤں باہر لپکا کار اسٹارٹ کی طارق کا گھر تو قریب ہی تھا اُڑتا ہوا پہنچا۔ دیگر شناسا بھی گھر میں دوڑے جا رہے تھے گھر میں ایک کہرام مچا تھا۔ طارق نے تہہ لگا کر دائیں جانب چادری سلیقے سے رکھی تھی چہرہ نماز کے رُخ تھا۔ بائیں کنپٹی پہ اس نے گولی چلائی تھی۔ چادری خون میں بھیگی ہوئی تھی۔ پڑوسیوں نے لان میں کرسیاں لگوادی تھیں۔ میں یہ منظر نہ دیکھ سکا اور درختوں تلے ایک کرسی پہ جا گرا۔ پولیس بھی دوڑی چلی آئی۔ پولیس کی مٹھی گرم ہوئی تو اتفاقی حادثہ قرار دے کر چادری اور گلاک 26 پستول بھی قبضے میں نہ لیا۔ ہر طرف شور اور چہ مگوئیاں تھیں جبکہ میں سوئے ہوئے دماغ کے ساتھ آنکھیں بند کیے بیٹھا ہی رہا۔ یہ طے پایا کہ اس کی بہن کی آمد پہ اگلے روز تدفین ہو گی۔ نظر بچا کے موبائل پار کیا پھر خون میں رنگین چادری اٹھالی۔ کسی نے اعتراض نہ کیا اس کی اہمیت نہ تھی۔ وہ اس بری طرح سے گال سے چپکی تھی کہ بمشکل ہی الگ کیا گیا تھا۔ چادری شاپر میں ڈال کر اس پہ سیاہ لفافہ چڑھا لیا۔ گھر میں کسی کو کسی کی خبر نہ تھی میں نے موقعہ پاتے ہی دروج کو خودکشی اور قیمتی تحفہ پہنچانے کی خبر دی اسے یہ اطلاع مل چکی تھی۔ کافی دکھی سی لگی۔ اس کے گھر بھی شادی کی تیاریاں تھیں عزیز و اقارب براجماں تھے۔ تاہم اس نے عقبی گیٹ سے لان میں دبے پاؤں چلے آنے کو کہا۔ اندھیرے میں عقبی گیٹ نیم وا تھا۔ اس کے وفادار ملازم نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر مجھے خاموشی سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ دروج کو بلا کر لایا۔ وہ بہت چوکنا اور محتاط تھا یوں لگتا تھا جیسے اشارہ پاتے ہی مجھ پہ ٹوٹ پڑے گا۔ دروج نے سر

کے اشارے سے سلام کیا اور اندھیرے کے سبب اس کے تاثرات کا جائزہ لینا ممکن نہ تھا۔ میرے ہاتھوں سے شاپر لے کر اس نے بیتابی سے شاپر کھولا مگر چادری دیکھتے ہی گھٹی گھٹی چیخ اس کے لبوں سے نکلی اس نے ڈوپٹہ ہونٹوں پر رکھ لیا اور ہزیانی انداز میں کچھ بولتی رہی جیسے آوازوں کو سینے میں روک لینا چاہتی ہو۔ ملازم نے چابکدستی سے چادر لے کر سمیٹ کر شاپر میں بند کر دی اور کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میرا فرض ادا ہو چکا تھا، میں واپس مڑا اور گیٹ کی جانب چل دیا۔ معاً ملازم نے میرا بازو تھام لیا اور پلٹنے کا اشارہ کیا۔ میں دوبارہ دروج کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''وصیت کے مطابق آپ کو قیمتی تحفہ پہنچانا ہے میرا تحفہ یہ بکرے کی کھال جیسی چادری نہیں بلکہ طارق کا موبائل ہے۔ جس میں ہمارا سارا ریکارڈ ہے تصویریں ہیں۔'' میری جیب میں پڑا موبائل تو تک کی اجتماعی قبر کی طرح بوجھل ہو کر ماتم کرنے لگا۔ میں نے دروج کے حسین لیکن سپاٹ چہرے کو دیکھا جو اندھیرے میں بھی اپنے حسن سے منور تھا۔ جس کا احاطہ ہی مشکل تھا جسے دیکھنے کے لیے ارجن کو دیوتاؤں کی بینائی دی گئی تھی اور میرے ساتھ تو تھ پر کرشن بھگوان بھی نہ تھے۔ اس ناز و انداز دلبری سے گھائل ہو کر سوچا کہ موبائل پیش کر دوں پھر خیال آیا کہ لمحہ لمحہ مرتی رہے۔ موبائل لانے والے کے قدموں کی چاپ سنتی رہے خولا کی کوتل کی طوفانی ہوائیں کھڑکیاں دروازے بجائے تو اسے گیٹ کی دستک سنائی دے۔ کانپ کانپ جائے۔ ہر اجنبی کال پہ تھرتھرا اُٹھے۔ سوتے میں گھبرا کر جاگ اُٹھے۔ ''وہ موبائل تو پولیس لے گئی'' میں نے بے رُخی سے جواب دیا۔ اس کا چہرہ سنگینوں میں گھرا گوادر بن گیا۔ آواران کی خشک ندیوں سے اجاڑ ہراساں۔ میں اسے دیکھے بغیر ہی دبے پاؤں باہر چلا آیا۔ گھر سے بدستور شہنائیوں کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

چہار غاش ___ (چار دانت) کوسنہ کا چار دانت نما پہاڑ

گواڑخ ___ صحرائی گل لالہ

خیسن ___ (سونا) درہ بولان کا پہاڑ جس میں خزانہ بھر سونا مدفون ہے۔

کوہ مراد ___ تربت کی مقدس پہاڑی

خولا کی کوتل ___ کولپور کا قدیم نام

تو تک کی قبر ___ خضدار کے نواح میں واقع تو تک جس کے گڑھے سے سینکڑوں گمشدہ افراد کے اجسام نکلے۔

گوادر ___ (گوات در) نیم بحری کا دروازہ

دروج ___ تیز رفتاری سے گزرنے والی ہوا سب کچھ اڑا لے۔

بندھن کا بوجھ

ثمینہ سید

''اس سے پہلے کہ آپ ہمیں کہیں سیر کے لیے لے جاتے، یا ہمارے ساتھ باہر کی دنیا میں ... کھلی فضا میں کہیں گھومتے پھرتے۔ یہ دن آ گئے۔ اور اب ....
آپ بھی اس قید کے ہاتھوں بے بس ہیں''
شفق نے مسکراتے ہوئے گہرا طنز کیا۔ تو حبیب احمد اسے گھور کر رہ گئے۔ جز بز ہوتے اٹھے اور غصے سے بولے

''بچوں کے سامنے میری بے عزتی کرنے سے فرصت ملے تو ایک کپ چائے لاؤنج میں پہنچا دینا.. اور ہاں ملازمہ کے ہاتھ بھیجنا۔''

''جی اچھا'' شفق نے شانے اچکائے۔ ان رویوں نے اسے بھی لاپرواہ بنا دیا تھا۔ وہ اس فینٹسی سے نکل آئی تھی کہ بیوی نہ چاہتے ہوئے بھی ''ملازمہ'' بنی رہے تو دل میں جگہ بنا ہی لے گی.. کچھ دیر بیٹھی رہی بچوں کی کھلی کتابوں میں دلچسپی کی کوئی چیز، کچھ نیا ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی۔ کیونکہ پچھلے ایک سال سے یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ وبا کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں، آن لائن کلاسز، کھانے پکانے، بیوقت چائے اور

طنزیہ بک بک۔

کبھی کبھار سکول والوں کے پرزور اصرار پر شفق اور حبیب احمد کو سلیقے سے تیار ہوکر کمپیوٹر کے آگے بھی بیٹھنا پڑتا۔ والدین کی حیثیت سے بہت سی چیزیں سمجھنا پڑتیں اور کئی طرح کے سوالوں کے جواب دینا پڑتے۔ اسے ہمیشہ یاد رہتا کہ وہ خود بہت ذہین فطین طالبہ تھی۔ ہمیشہ پہلی پوزیشن پہ اسی کی اجارہ داری رہتی۔ یونیورسٹی میں بھی گولڈ میڈل سے نوازا گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسکے ابا نے ہمیشہ اس کی پسند اور دلچسپی کو ترجیح دی تھی۔ ہمیشہ اسی کی منتخب کردہ سمت میں اسے چلنے دیا۔ نا صرف اس کا ساتھ دیتے پیسہ بھی لگاتے۔ لیکن نجانے کیوں ناز نخرے اٹھانے والے یہی والدین بیٹیوں کی شادی کے وقت روایت پسند اور کٹھور بن جاتے ہیں۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی ایم فل، ایچ ڈی کے بعد شادی کرنے کا سوچنا چاہتی تھی۔ لیکن امی کو خدشوں کے ناگ ڈستے رہتے۔ لڑکی کی عمر زیادہ ہوجائے گی تو رشتہ نہیں ملے گا، اسکی سوچ پکی ہو جائے گی تو ہماری نہیں سنے گی اور سب سے بڑھ کر تو امی کو شیطان کے شر سے خوف آتا رہتا۔ اکثر کہتیں:

''شیطان انسان کے ساتھ ہی ہوتا ہے ہر پل نجانے کب حاوی ہوجائے۔ ہماری نانی کہتی تھی برائی اور بیراہروی تو قبر کی دیواروں تک پیچھا کرتی ہے۔ مرتے مرتے بھی گناہ سرزد ہوسکتا ہے۔ اور ہم پڑھنے کی آزادی دے کر لڑکیوں کو شتر بے مہار ہی کر چھوڑتے ہیں۔''

''تو اللہ کا نام لے کے رشتہ ڈھونڈ بھلیے لوکے..... میری دھی رانی میرا فخر ہے، مان ہے میرا۔'' ابا جی کہتے تو شفق کی آنکھیں بھر آتیں۔

تب ان باتوں کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے یہ خدشے یہ مان کے تالے عقل سے ماورا لگتے تھے لیکن اب..... اب جب وہ بہت بڑے بزنس مین حبیب احمد کی بیوی بن چکی تھی۔ دو بیٹیوں کی ماں بن چکی، تو گاہے گاہے امی کی باتیں دل کے دروازوں پہ دستک دیتی رہتی تھیں۔

''امی حق بجانب تھیں۔ لیکن شادی کرتے وقت بھی بیٹی کی پسند، عمر اور ذوق کا خیال رکھ لیتیں تو..... اچھا ہی ہوتا۔'' شفق اکثر کام نپٹاتے اسی طرح کے فقرے بڑبڑاتی رہتی تھی۔

بچے سکول چلے جاتے اور میاں صاحب کروفر سے تیار ہوکر اپنے کام پہ چلے جاتے۔ اس کے سسرال والوں کے بہت بڑے مال میں کروڑوں روپے کی دکانیں اور بزنس تھے۔ اونچی سے اونچی اڑان۔ ایکدوسرے سے بڑی گاڑیاں، کئی کئی کنال

پہ پھیلے گھر، میک اپ زدہ چہرے، باہر کے کھانے اور دنیا بھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی- باہر سے پڑھ لکھ کے آئے نوجوان بھی اسی بزنس میں لگ جاتے- سب پہ دو کو چار کرنے کی دھن سوار تھی- کمی تھی تو محبت کی اور شدید کمی تھی تو ساتھ کی، تعلق میں خلوص کی- جو شفق جیسے مڈل کلاسیوں کا خاصا بڑا مسئلہ تھا- وہ چاہتی تھی حبیب احمد اسے اور دونوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر دنیا دکھائیں- اکٹھے بیٹھ کے کھانا، بہت دیر تک باتیں کرنا اور اپنی مرضی کے پکوان بنانا جیسے عام سے اس کے خواب تھے- وہ مرد کے ساتھ کو حصار کی طرح اپنے گرد لپیٹنا چاہتی تھی-

لیکن ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے نوکر تھے- کھانے کی ہدایات خانساماں کو دی جاتیں- حبیب احمد اکثر طنز کے تیر چلاتے رہتے-

"یہ مڈل کلاسیے شوق کہیں دفن کرو شفق بیگم- اسٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے آپ پر توجہ دو- اس گھر گرہستی کی، سگھڑاپے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اور ہاں گاڑی خود چلانا سیکھو، پیسہ خرچ کرنے کے طریقوں پہ غور کرو- وہ جو تمہاری ذہانت تھی ناں اس کی یہاں کسی کو بالکل بھی ضرورت نہیں ہے- زندگی کے ساتھ دوڑنا سیکھو تاکہ میری بچیوں کی اچھی تربیت کر سکو- فیشن اور ٹیکنالوجی کا دور ہے بی بی--- رٹو پن اور ذہانت کے زعم میں رہنے کا نہیں-"

شفق نے اپنی اخلاقیات اور تربیت کے مطابق نئی زندگی کا آغاز کیا تھا، رشتوں کو بنانے اور نبھانے کی ہر کوشش کر دیکھی تھی- لیکن یہاں سب اپنی مرضی اور اپنی پسند کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے- ہر کوئی دوسرے کو نیچا دکھانے کی سرتوڑ کوشش میں تھا- وہ کبھی ان سب کے ساتھ بھاگنے لگتی- شاپنگ، پارلرز، پارٹیاں، فیشن شوز، سوشل ورک - - ہوٹلنگ سب کچھ کرتی اور کبھی تنہائی کے صحراؤں میں نکل جاتی- بے اعتنائی کے سرپٹ گھوڑے اس کی خاک اڑاتے- تو وہ گم ہوتے ہوتے گمراہ ہونے لگی - مضطرب روح کا چین ڈھونڈنے نکل پڑتی-

بیشمار طنز اور روکھے رویے شفق کی پوروں پہ جمتے جا رہے تھے- گھر میں ہر طرح کا آرام اور سہولتیں تھیں جن کی وجہ سے ہر دیکھنے والی آنکھ شفق کو خوش قسمت کہتی- کوئی کیا جانے رشتے میں بلا کی گھٹن اور سرد مہری تھی - حبیب احمد تعلق کی انتہا پہ بھی اسے "ناشکری عورت" کہتے ہوئے الگ ہوتے- جو لمحے ان کو درکار ہوتے ان میں

شفق پوری طرح انوالو ہو ہی نہیں پاتی تھی۔ انسان مشین بن کر ہر ضرورت پوری کرسکتا ہے۔ لیکن جذبے..... ان کی اپنی سرکشی ہے، اپنی مرضی، اپنا ہی رچاؤ۔ ان پر زور زبردستی نہیں چلتی۔ اگر زبردستی کرنے کی کوشش کی جائے تو تعلق تڑک کر رہ جاتے ہیں اور منہ زور ہواؤں کی طرح مرضی کے رخ پہ نکل جاتے ہیں..... یہی شفق کے ساتھ ہو رہا تھا۔ تمام پیسے والوں کی طرح اسے بھی ڈپریشن ہونے لگا، زبان درازی ہونے لگی۔ کچھ دن لبی چپ چلتی اور باقی سارے دن دو بدو لڑائی چلتی رہتی۔

اچانک زندگی نے پینترا ہی بدل لیا۔ رواجوں، حکایتوں اور دوڑتی بھاگتی مشینوں کو سٹاپ لگ گیا۔ ایسی رکاوٹ..... ایسا ٹھہراؤ جو انسان کی سوچ اور اندازے سے بہت اوپر تھا تو انسان کا کسمسانا، الجھنا، مضطرب ہونا لازم تھا۔ وقت نے مٹھی بند کرلی۔ زندگی کو اسٹیٹس کا ناچ نچانے والے خود ایک انوکھی، ان چاہی تال پہ تھرکنے لگے۔ بےبسی انتہاؤں پہ تھی۔ ساری دنیا ہی ایک دم بے بس ہوگئی "وبا" کی مرضی کے مطابق روز و شب کی ترتیب بنائی جانے لگی۔ گھر آباد اور گلیاں، بازار ویران ہونے لگے۔

باہر کھلی فضا اور چور جگہوں میں پنپنے والے سچے جھوٹے رشتے دم توڑنے لگے تو گھروں میں قید سچے رشتوں میں ملاوٹ کرنے والے لوگ مرغ بسمل بنے تڑپ رہے تھے۔ وبا زوروں پہ تھی اسے سائنس کی کوئی چال، گھناؤنی سازش کہا جاتا تو کبھی مذہب سے دوری کو وجہ گردان کر خوف و ہراس پھیلایا جاتا۔ راتوں میں گھروں کی چھتوں پہ بیوقت اذانیں دے کر سمجھا جاتا کہ یوں روٹھے ہوئے رب کو منالیں گے۔ وقت وبا کے چنگل میں جکڑا اڑیل پن دکھا رہا تھا۔ انسانوں کو دھڑا دھڑ موت نگل رہی تھی اور قبریں اگلنے لگی تھیں۔ شمشان گھاٹ اور قبرستانوں کی اراضی ناکافی لگنے لگی تو لاشیں دریاؤں میں بہائی جانے لگیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ موت کا سناٹا۔ کسی صورت بھی کاروبار حیات ڈگر پہ نہیں آرہے تھے۔ اور بے نتھے بیل جیسے خود سر مرد — مرضی کی مالک ہوچکی بیویوں کے سر پر سوار تھے۔ بیویاں بھی نوکروں کو فارغ کر کے خود ہر کام کرنے پہ مجبور تھیں، ہر ایک کام سے بڑا اور صبر آزما کام دن رات کے تمام گھنٹے شوہروں کے مزاج کے مطابق چلنا تھا۔ بے شک راستے کھوٹے ہوچکے ہوں۔ دل نفرتوں سے اور منافقتوں سے بھر چکے

ہوں۔ جذبے سرد بھی ہو چکے ہوں بستر گرم رکھتا تھا۔

بہت ہی کم لوگ تھے جنہوں نے فاصلہ رکھنے کے دنوں میں فاصلے مٹائے ہوں اور محبت کی راہگزر پہ چل پڑے ہوں۔ ورنہ طلاقوں کی شرح زیادہ ہو رہی تھی۔ آن لائن موٹیویٹرز اور ماہرِ نفسیات رواج پا رہے تھے ۔اس اتار چڑھاؤ میں جذبوں سے ملمعے اتر رہے تھے۔ شوہر جو مہینہ بھر وضعدار بنے پھرتے رہتے تھے اب روز آپے سے باہر ہو جاتے۔ تو ایسے میں شفق کا حیران ہونا بنتا ہی تھا نا صرف حبیب صاحب کے محبت سے لبریز لہجے میں بلانے پہ حیران تھی وہ تو خود پہ بھی حیران تھی۔ آج شام سے ہی مزاج میں چاہتوں کی ملاحت اتر رہی تھی۔ مسکرا مسکرا کر سج سنور رہی تھی۔ چال میں بھی مستی در آئی تھی۔ سمٹتے ہوئے فاصلے اسے خوش فہمیاں دے رہے تھے۔ اس نے بخوشی سمیٹ ڈالے۔ یا پھر کسی کی یاد نے بحال کر دیا تھا۔۔ ہجر نے ہرا دیا تھا۔ ایسے ہی بہکتے پل میں حبیب احمد نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ کسی معمول کی طرح چلتی گئی۔ مقابل کرم پہ خوش ضرور تھا لیکن بار بار چونک رہا تھا۔ انداز، ادائیں اسے زیر بار کیے دے رہی تھیں۔ بیوی سے اکثر مرد ایسی محبت کی توقع نہیں کر رہے ہوتے۔ شریف بنے رہتے ہیں تا کہ بیوی بھی حد میں اور اوقات میں رہے۔ لیکن اب اس وبا نے گھروں تک ہی محدود کر دیا تھا تو رشتے ہی غنیمت لگ رہا تھے سارے چھل کپٹ دم توڑ رہے تھے۔ اصل چہرے چھپانے مشکل ہو رہے تھے۔

جب جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا تو حبیب احمد نے سخت سناٹے میں شفق کو دیوانگی سے چومتے ہوئے سرگوشی کی۔

"یہ ہی مس کر رہا تھا ...... یہی سب...... شیلا مائی ڈیئر ...... - - شیلا!!!!!! ...... -لویو ......سـکاری بھری آواز نے شفق کے حواس بحال کر دیئے "

شفق نے آواز کی ٹوٹتی، لرزتی، نشے میں ڈوبی بازگشت پہ خود کو گہرے سمندر میں گرتا محسوس کیا۔ ماحول کا سارا سحر ایک چھناکے سے ٹوٹ رہا تھا شور تھا...... بلا کا شور۔۔ لیکن موت جیسی چپ بھی تھی۔ سو بھید کھولتی زہریلی چپ ......وہ ایک طرف گرتی ہوئی دوہرے درد سے بحال تھی۔۔۔ بالکنی سے آتی ہلکی سی روشنی میں اس اپنے۔۔۔ لیکن یکسر اجنبی شخص کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ......" "وہ" "نہیں تھا" وہ بندھن کے بوجھ تلے دبی بری طرح کراہی۔

☆☆☆☆☆☆

بلاعنوان

2020 پوری دنیا ایک اَن دیکھی بیماری میں مبتلا ہے شام کا وقت ہے ایک جدید شہر کے مکان میں ایک چار سالہ بچہ، اس کی ماں، بچے کا والد اور ایک بارہ سالہ بہن خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ باپ مسلسل ٹی وی دیکھ رہا ہے اسے گردو پیش کی کوئی خبر نہیں۔ ماں اپنی ڈائری میں کوئی ضروری شیڈول لکھ رہی ہے بہن اپنا سکول کا کام کر رہی ہے اور چھوٹا بچہ کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے میں جا رہا ہے۔ اس کی دلچسپی کا وہاں کچھ نہیں ہے۔ کھلونوں سے کھیل کر تھک چکا ہے باہر جانے پر پابندی ہے لہٰذا وہ سارا دن وہیں گھومتا رہتا ہے---

چھوٹا بچہ: آپی مجھے میری گاڑی نکال دو۔

آپی: اچھا دیتی ہوں

قریب پڑی بچوں کی الماری سے اسکی بلیک کار نکال کر دیتی ہے جو اسے بہت پسند ہے۔ چلو وہاں بیٹھ کر آرام سے کھیلو میں آن لائن کلاس لے رہی ہوں، وبا کے دنوں میں کوئی بچہ سکول نہیں جاتا اس لیے وہ بچی آن لائن کام کرنے لگی۔

بچہ کچھ دیر بعد بور ہو جاتا ہے اور اپنی ماں کے پاس جاتا ہے۔

ماما جوس پینا ہے۔

OK میں ابھی لاتی ہوں اپنے سوہنے بیٹے کے لیے۔

ماں کچھ دیر میں جوس کا گلاس تھامے کمرے میں آتی ہے اور بچے کو جوس تھما دیتی ہے تھینک یو: بچہ خوش ہو جاتا ہے اور مزے مزے سے جوس پیتا ہے، جوس پینے کے بعد وہ ٹی وی دیکھتا ہے مگر وہاں اسے اپنی مرضی کا کچھ نہیں ملتا۔ وبا کے دنوں میں ہر گھر میں تقریباً ہر وقت ٹی وی دیکھا جا رہا ہوتا ہے کیونکہ لوگ نئی خبر کی تلاش میں نیوز سنتے ہیں، بچے کے گھر میں تقریباً ہر وقت ہی نیوز چلتی ہیں اس لیے وہ بہت پریشان ہوتا ہے۔ باپ کے پاس جاتا ہے۔

بابا: مجھے کارٹون دیکھنے ہیں، چیکی والے، معصوم سی شکل بنا کر دیکھتا ہے ابھی نہیں بعد میں ابھی نیوز چل رہی ہیں باپ ٹی وی کی طرف دیکھتے دیکھتے جواب دیتا ہے۔

بابا: اپنے موبائل میں کارٹون دیکھا دیں ناں، بچہ باپ کو دوسرا آپشن دیتا ہے۔

باپ: نہیں ابھی نہیں بعد میں ایک ہاتھ میں موبائل جس سے وہ فیس بک، گوگل اور پتہ نہیں کیا کیا دیکھ رہا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے ریموٹ کو اپنے سینے پر رکھے ہوئے جواب دیتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے موبائل میں ہی دیکھا دیں، بچہ ہے اسے کیا پتہ دنیا کس آفت میں مبتلا ہے، ماں نے اپنا کام روک کر کہا۔

یار حد کرتی ہوں تم بھی بچوں والی بات کرتی ہو، دنیا ایک اَن دیکھے موذی مرض میں مبتلا

نوین روما

ہے مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے ابھی تک کوئی ویکسین تیار نہیں کر سکا دنیا میں اتنا بدلاؤ آگیا تم ابھی بھی بچے کو کارٹون دیکھانے کا کہہ رہی ہو۔
بچے کے باپ نے ماں کو ہی لیکچر دے ڈالا۔
بچہ ان سب باتوں کو نہیں جانتا، ماں نے صفائی دی۔
ارے میرے لیے ٹی وی پر دنیا بھر کے تجزیاتی مکالے سننے بہت ضروری ہیں اور ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کو بھی دیکھنا ہے وہاں کیا خبریں ہیں اپنے دور دراز کے دوست احباب اور انٹرنیٹ فرینڈز سے بات چیت کرنا بھی ضروری ہے کم آن یار۔ باپ نے یہ ساری باتیں موبائل کی سکرین پر نظریں جمائے ہوئے کہیں۔۔
بابا: چی جی کھانی۔۔ بچہ تو نادان تھا پھر بول پڑا
اوہو بعد میں کہا نا اچھا اسے پکڑو سائیڈ پر لے جاؤ بولتا ہی جا رہا ہے مجھے تو بجے کا بلیٹن سننا ہے ویسے بھی کوئی بریکنگ نیوز آرہی۔۔
اچھا چلو آؤ ہم چھت پر جاتے ہیں، بادلوں پر جا کر آئس کریم کھاتے ہیں ماں نے بچے کو اُٹھایا، بچہ خوشی سے جھوم اُٹھا اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

2040

دنیا کا جدید ترین شہر

کمرے میں ایک جوان لڑکا بیٹھا ٹرانسپرنٹ وال پر اپنی اسائمنٹ مکمل کر رہا ہے، ایک جیلی نما بٹن اس کے پاس ٹیبل پر پڑا ہے جس کو کچھ دیر بعد وہ لوکیشن سینڈ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے، کمرے کے تینوں اطراف میں شیشے کی دیواریں ہیں اور دور تلک شہر کی روشنیاں نظر آرہی ہیں۔ لڑکے کی ماں کمرے میں داخل ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس ہے جو وہ بیٹے کی طرف بڑھاتی ہے بیٹا مسکراتے ہوئے ماں کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لے لیتا ہے۔ ماں پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھرتی ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے اپنی عینک اتار کر کرسی پر ٹیک لگا لیتا ہے۔
ماما آپکے ہاتھ مجھے لگتے ہی ساری تھکن دور ہوجاتی ہے۔ لڑکا پیار بھری نظروں سے ماں کو دیکھتا ہے۔
ماں مسکرا کر پاس رکھے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور بیٹے کو جوس پیتے دیکھتی ہے۔ اسی اثنا میں لڑکا جیلی نما بٹن دباتا ہے تو ایک لڑکی فوراً تھری ڈی کی شکل میں اسکی دیوار پر نمودار ہو کر کمرے میں چلنے پھرنے لگتی ہے اس وقت وہ آن لائن ہوتی ہے اور ایک دور دراز ملک سے اس سے بات کر رہی ہوتی ہے۔
ماں اٹھنے لگتی ہے تو وہ اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ایک غیر ملکی لڑکی زبان بول رہی ہوتی ہے جس کا ترجمہ لڑکے کا ٹرانسپرنٹ موبائل ساتھ لگے سپیکر سے کر رہا ہوتا ہے۔
لڑکا کہتا ہے کہ 5 منٹ بعد ہم آن لائن میٹنگ کرتے ہیں اور لڑکی غائب ہو جاتی ہے۔
بیٹا کچھ آرام بھی کر لو کئی دنوں سے کام کر رہے ہو۔ ماں نے فکر مندی سے کہا۔
ماما اس وقت پوری دُنیا کو ایک چیلنج ہے ہم ایک موذی مرض میں گرفتار معاشرے میں

ہیں اور اس کی دوا تیار کرنا ہمارا مشن ہے ابھی دنیا کے مختلف کونوں سے ڈاکٹروں کے ساتھ میری آن لائن میٹنگ ہے ہماری کوشش ہے یہ ویکسین جلد سے جلد تیار ہو اور ہماری کمپنی میں دنیا کے بہترین ڈاکٹرز ہیں لڑکے نے سنجیدگی سے ماں کو بتایا۔

اچھا بیٹا تم اپنی میٹنگ کرو میں باہر لاونج میں بیٹھی ہوں - تھینک کیو ماما۔ ہسپتال جاتے ہوئے مل کر جاؤں گا۔ ماں باہر جانے کے لیے اُٹھی تو کمرے کا دروازہ کھلا، لڑکے کا باپ اندر آ رہا تھا۔

بیٹا ایک ضروری بات بتانی تھی تمہیں جو تمہاری ویکسین کے لیے بہت کام آئے گی۔

بابا ابھی میں ایک آن لائن میٹنگ کرنے لگا ہوں کچھ دیر بعد میں بات کرتے ہیں۔

او اچھا ٹھیک ہے، باپ دروازے سے ہی باہر چلا گیا۔

او کے بیٹا آپ کام کرو، ماں بھی باہر لاونج میں چلی گئی، پندرہ منٹ تلک دُنیا کے مختلف ایکسپرٹس کے ساتھ میٹنگ کرنے کے بعد لڑکا جیلی والے بٹن کو پریس کرتا ہے اور سب کچھ ایک جھٹکے سے بند ہو جاتا ہے وہ اُٹھتا ہے اور کمرے سے باہر نکل آتا ہے۔

لاونج میں اسکی ماما اور بابا بیٹھے ہوتے ہیں۔

باپ فوراً بولتا ہے کہ بیٹا جب تم چار سال کے تھے اس وقت بھی ایک جان لیوا وائرس نے دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا جو Pandemic تھا اور میں نے سوشل میڈیا اور مختلف چینلز پر اسکی بہت ریسرچ کی بہت سے آرٹیکلز پڑھے تھے، میں تمہیں بہت سی انفارمیشن دے سکتا ہوں۔

بابا: اس زمانے کے وائرس میں اور آج کے وائرس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اس وائرس کی Rays ہیں اور یہ ساونڈ کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور دنوں میں نہیں گھنٹوں میں انسان کو بدل سکتا ہے صرف ٹی وی چینلز پر پروگرام دیکھنے سے اس کا حل تلاش نہیں کیا جا سکتا ہمارے پاس دُنیا بھر سے ایکسپرٹس ہیں اور ہماری لیبز میں دن رات ریسرچ ہو رہی ہے۔

پوری دُنیا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہے، یقیناً ہم اگلے ہفتے تک

اس پر قابو پا لیں گے

آپکے زمانے کے وائرس کے Facts & Figers میں بہت فرق ہے۔

میں پھر بھی آپ سے پرانی سٹوری سنوں گا لیکن بعد میں ابھی مجھے جانا ہے

یہ کہہ کر وہ ماں کی طرف بڑھا ماں نے اٹھ کر بیٹے کا ماتھا چوما تو لڑکے کا چہرہ کھل اُٹھا۔

باپ دور بیٹھا اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اُٹھنے کی کوشش تو بیٹے نے وہیں دور سے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھے رہنے کو کہا اور بولا

بیٹھے رہیں بابا پھر بعد میں ملتے ہیں اور داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

باپ کھڑکی سے بیٹے کی کار کو دور جاتے ہوئے دیکھنے لگا---

☆☆☆☆☆

احمق

پھر میں نے سنا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے اپنے ضلع کے حدود میں اس ویڈیو پر پابندی لگادی ہے اور اس کا دیکھنا جرم قرار دے کر خلاف ورزی پر جیل یاترا کی سزا مقرر کی ہے- ڈپٹی کمشنر صاحب کے اس اقدام کو عوامی حلقوں میں کافی سراہا جارہا تھا اور اس کے فرض شناسی اور جذبہء انسانیت کی کھل کر تعریفیں ہورہی تھیں- جس ویڈیو پر پابندی لگی تھی اس میں اس بندے کو اپنی داڑھی اور سر کے بال دونوں ہاتھوں سے نوچتے اور اپنے رخساروں پر بے تحاشا تھپڑ برساتے دیکھا جا سکتا تھا؛ ساتھ ہی آہ و بکا کرتے ہوئے آنسوؤں کا بہتا سیلاب اس کی گریبان کو بھگوتا صاف دکھائی دے رہا تھا- چار پانچ منٹ کی ویڈیو میں اس کی ساری زندگی کی محرومیاں، پریشانیاں اور مایوسیاں یکبارگی جمع ہوکر آنکھوں کے راستے بہہ نکلی ہیں- یہاں پر آپ کو انسانیت سسکتی نظر آتی ہے اور اشرف المخلوقات کی حیوانیت انتہا پر---!!! اس سے پہلے اسے احمق اور بے وقوف ظاہر کرنے کے لئے اس کی کئی ویڈیوز بنائی گئی تھیں جس میں اس کی عزت نفس کا جنازہ نکال دیا گیا تھا- ان ویڈیوز کو بہت سارے آدم زادوں نے اپنے موبائلز میں محفوظ کرلیا تھا اور جب چاہتے دل کو خوش کرنے اسے دیکھ لیتے-

چلیں جی! اتنا تو ہوا کہ کسی کو اس کے ساتھ انجانے میں یا جان بوجھ کر روا رکھے جانے والے ظلم کا احساس تو ہوا- یہ واقعہ اور فیصلہ شائد اس بے حس اور ظالم قوم کی آنکھیں پوری طرح کھول تو نہ سکے مگر ممکن ہے کہ چند بے ضمیروں کا ضمیر جگانے میں کامیاب ہو جائے- معاشرے کے وہ بے حس افراد جن کی درندگی آج بھی ان سے اس واقعے پر قہقہے لگواتی ہے؛ شائد باز آجائیں- فکر معاشرے یا اس کے قدروں کی نہیں؛ پریشانی اس بات کی ہے کہ کیا ہم اس بندے کے ذرے ذرے وجود کو یکجا کرپائیں گے---؟ کیا یہ معاشرہ اس کے ریزوں کو جوڑ کر اسے

نور کمال شاہ

دوبارہ اصلی حالت میں لا سکے گا---؟اس کے احساس کی؛ خود داری کی؛ اعتماد کی؛ عزت کی کرچیاں کیا کبھی دوبارہ جڑ سکیں گی--؟ میرے خیال میں تو کبھی نہیں! کبھی بھی نہیں----!!!

اللہ کسی کو حساس طبیعت نہ دے؛ خاص کر جب وہ غریب اور تنگ دست بھی ہو- حساس طبع انسانوں کے ساتھ معاشرے کا کھلواڑ ناقابل برداشت بن جاتا ہے- ہمارا معاشرہ مالدار اور طاقتور لوگوں کا معاشرہ ہے- انہی دو طبقات کی برائیاں خامیاں اور کمزوریاں ان کی اعلیٰ صفات گردانی جاتی ہیں اور تمغہ بنا کر ان کے گلے میں آویزاں کرا دی جاتی ہیں جبکہ کسی بے بس، کمزور اور غریب میں پائی جانے والی یہ خامیاں جرم قرار دی جاتی ہیں اور ان لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا جاتا ہے-

وہ میرے پڑوس میں رہتا تھا اور چند سال تک میرا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا- میٹرک تک ہم ساتھ رہے؛ بعد میں مجھے شہر آنا پڑا اور وہ گاؤں ہی میں زندگی کے رنگ دیکھتا اور حیات کی چکڑا گاڑی کو کھینچتا رہا- وہ نہایت حساس طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا اور اسی حساسیت نے اس کی زندگی کو بہت ہی مشکل اور پیچیدہ بنا رکھا تھا- معمولی سی بات کو ذہن پر سوار کر لیتا اور دنیا والوں سے جھگڑنے لگتا- معاشرے نے اس کی حد درجہ سادگی کو حماقت کے پلڑے میں ڈال دیا تھا اور یہی سادگی اس کے لئے عذاب بنی ہوئی تھی- وہ جھوٹا نہیں تھا، فریبی نہیں تھا اور نہ ہی منافق تھا- لوگوں کے بناوٹی لہجے اور مصنوعی چہرے اسے تکلیف پہنچاتے- برداشت کا مادہ اس میں بالکل ناپید تھا؛ لوگوں کے رویے اسے ردعمل پر اکسانے؛ وہ لوگوں سے، بستی سے، سماج سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا مگر کمزور اور کمتر خاندان سے تعلق کی وجہ سے لڑ نہ پاتا- لوگ پل کے پل میں اسے سیدھی راہ دکھا جاتے اور وہ اپنے وجود کے اندر ہی اندر گھٹتا، سسکتا اور بل کھاتا رہتا- اس کی یہ کیفیت شروع ہی سے تھی- کمزور اور شریف ہونے کے ناطے انتہائی بزدل بن چکا تھا- معاشرے نے بھی اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھا کر اسے اتنا رگڑا تھا کہ اس کی ہمت، طاقت اور توانائیاں تک چھین لی تھیں- بات بات میں اس کا مذاق اڑایا جاتا؛ قدم قدم پر اسے بے وقوف بنایا جاتا اور جب وہ کوئی ردعمل دکھاتا تو لوگ اسے مارنے کو چڑھ دوڑتے- دوستوں اور بہی خواہوں نے اس سلوک کا نام گپ شپ اور دل لگی رکھا تھا- وہ ایک طرح سے اس کے ساتھ اپنائیت برت رہے تھے، مذاق کر رہے تھے اس کے ساتھ، مگر جو کچھ اس کے دل پہ گزرتی اور جس طوفان کو وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے تھا، کوئی نہیں جانتا تھا- اسے یوں لگتا جیسے سارا زمانہ اس کا دشمن ہے اور پوری دنیا بلکہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے- لوگوں کے رویے اور سلوک نے اسے عدم تحفظ کا شکار بنا

دیا تھا - انجا کو پہنچا ہوا کمتری کا احساس اس سے جینے کی راہیں چھین چکا تھا - وہ زندگی گزار نہیں رہا تھا بلکہ ایک پرخار راستے پر اپنی زندگی کی لاش کو کھینچ رہا تھا اور اب اسے کھینچتے کھینچتے وہ تھک کر بے حال ہو چکا تھا - وہ اب کسی نہ کسی طریقے سے اس زبردستی کے لبادے کو اتار پھینکنا چاہتا تھا جسے وقت اور زمانے نے زندگی کا نام دے کر اس کے وجود پر چڑھا لیا تھا - کئی دفعہ اس کے دل میں خودکشی کا خیال بھی پیدا ہوا - ایک آدھ بار اس نے اس خیال کو عملی بنانے کی کوشش بھی کی مگر روایتی بزدلی آڑے آ گئی اور وہ خود کو مار نہ سکا -

گھر میں ملنے والی محرومیاں کیا کم تھیں کہ ساتھ ہی جسمانی عیوب بھی اس کے حصے میں آئے - چھوٹا قد، غیر دلکش چہرہ؛ اور ناگوار خدوخال اسے سر اٹھا کر جینے سے باز رکھے رہے - بولنے کا غیر واضح لہجہ اور بھدی آواز نے تو اس کا رہا سہا اعتماد بھی ختم کر دیا اور اس کے اوپر حد درجے کی ناچاری اور ناداری - زندگی پل صراط تھی اس کے لئے -

بھاگتے وقت کے قدم بھلا کون روک سکتا ہے، روکنا تو دور کی بات آج تک کوئی وقت کے بھاگنے کی رفتار بھی کم نہیں کر سکا ہے - تعلیم کے مرحلے مکمل ہوئے برسوں گذر چکے تھے - اب میں شہر میں ایک اچھے عہدے پر تعینات تھا اور وہ گاوں ہی میں محنت مذدوری کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہا تھا - اس واقعے کے تین مہینے بعد میں چھٹی پر گاوں پہنچا تو صورت حال سے واقف ہوا، اگرچہ چند اڑتی خبریں مجھ تک باہر بھی پہنچا کرتی تھیں مگر میں نے انہیں سنجیدہ نہیں لیا تھا - یہاں آ کر معلوم ہوا کہ صورتحال کافی بگڑ چکی ہے - اگر جلد ہی اسے ذہنی اور جسمانی تحفظ نہیں دیا گیا تو شائد ہمارے ہاتھوں ظلم سرزد ہو جائے گا اور اس کی تلافی بھی ممکن نہیں ہوگی - کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اسے کھو ہی دیں - میں نے اس کے بکھرتے وجود کو سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا - ایک انسان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے، میں اسی عقیدے کا پیروکار تھا - اس کار خیر کے لئے میں نے چند دوستوں کو بھی اعتماد میں لیا - تلخ ماضی کو کچھ وقت کے لئے اس کے ذہن سے نکالنا بہت ضروری تھا چنانچہ اولین قدم کے طور پر میں اسے اپنے ساتھ چند دن کے لئے شہر لے آیا - اچھے اچھے کھانے کھلائے، پارکوں میں گھمایا پھرایا اور سنیما گھر میں فلمیں بھی دکھائیں - بہت خوش تھا اور کوئی پریشانی اسے تنگ نہیں کر رہی تھی - اپنے ایک جاننے والے ماہر نفسیات سے میں پہلے ہی بات کر چکا تھا اور اسے مدد پر آمادہ کر چکا تھا چنانچہ اپنے پروگرام کے عین مطابق ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس کے دو تین کونسلنگ سیشن کرائے اور اس کے بعد اسے واپس گاوں لے گیا - اب وہ مجھے کافی مطمئن اور پرسکون لگ رہا تھا - راستے بھر میں نے بھی اس کا رویہ بدلنے کی کوشش جاری رکھی - میں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو! بھوک

میں کوئی تمہاری بھوک مٹانے نہیں آئے گا بلکہ تم خود ہی اپنی بھوک کا علاج ڈھونڈو گے- اسی طرح اپنی ہر مصیبت اور تکلیف تمہیں خود دور کرنی ہے، کوئی مدد نہیں کرے گا- بیمار پڑو گے تو کوئی دوسرا تمہاری جگہ کام پہ نہیں جائے گا- تمہیں درد یا تکلیف پہنچے گی تو کوئی تمہاری جگہ چلائے گا نہیں بلکہ اپنے درد پہ چیخنے چلانے والے تم واحد انسان ہو گے؛ دوسرے صرف تماشا دیکھیں گے- تمہارا مکان گرے گا تو تمہارے سوا کسی پہ کوئی اثر ہی نہیں پڑے گا؛ کوئی تمہیں اپنا مکان پیش نہیں کرے گا- جب ایسا ہے کہ کسی کو تمہاری کوئی پرواہ ہی نہیں ہو گی تو تجھے لوگوں کی پرواہ کیوں ہو؛ ہاں اگر ان کی کوئی مدد کر سکتے ہو تو کرتے رہو مگر اپنی عزت کی قیمت پر کبھی بھی نہیں- میرے خیال میں وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا-

اس واقعے کے چار پانچ دن بعد صبح کام پر جانے سے قبل وہ گھر کے لئے سبزی لینے نکلا تھا اور دکان سے اپنی ضرورت کی چیزیں لے کر اپنی تھیلی میں ڈال رہا تھا کہ ذرا فاصلے پر موجود مرویز کی نظر اس پہ پڑ گئی:- مرویز اسے تنگ کرنے اور اس کی زندگی دوبھر کرنے میں پیش پیش رہا تھا- اپنی سابقہ عادت سے مجبور ہو کر وہ فوراً" وہاں پہنچا اور اشارہ کر کے تین چار اور لفنگوں کو بھی وہاں بلا لیا- وہ سمجھ گیا کہ مرویز دوبارہ صبح ہی صبح تماشا بنانا چاہتا ہے- اب کی بار اسے تماشا بننا بالکل بھی منظور نہیں تھا بلکہ وہ اب تماشا دکھانا چاہتا تھا- قریب پہنچ کر مرویز نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور السلام علیکم کہا- "اچھا!! تو میرا شہزادہ سبزیاں خرید رہا ہے، دیکھو بھائیو! آج ہمارا خان سبزی کھائے گا؛ بھائیو! آج تو ضرور ان کے مہمان بنیں گے- واہ بھئی کیا شان ہیں ہمارے لاڈلے کے.....!!! - مرویز کا استہزائیہ انداز اسے بہت برا لگا تاہم وہ اس دوران بڑا فیصلہ کر چکا تھا- اپنے اوپر چڑھتے طوفان کو روکنا اور اس کا رخ بدلنا ضروری ہو گیا تھا - جیسے ہی مرویز نے اصل موضوع کی طرف آ کر اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا؛ اس کا زوردار ہاتھ قہر بن کر اس کے بائیں رخسار پہ اتنی زور سے پڑا کہ پورے جبڑے کو ہلا گیا- مرویز کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ آنکھیں پھاڑ کر شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا- اردگرد کھڑے چار پانچ بندے بھی پکا بکا کھڑے اسے تک رہے تھے- اس نے اطمینان سے سبزی کی تھیلی اٹھائی اور کوئی لفظ منہ سے نکالے بغیر سکون سے گھر کی جانب چل پڑا- مسکراہٹ کا پرتو اس کے چہرے پر واضح دکھائی دے رہا تھا- وہ آج کا فاتح تھا- ذرا سی ہمت اور حوصلے نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا- اس وقت وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا - مرویز اور اس کے ساتھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے- میں بھی ذرا فاصلے پر دوکان کی اوٹ میں کھڑا مسکرا رہا تھا ------!!!!!!

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے ٹلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

پیٹ پانگ: پیٹ پانگ کا علاقہ دیکھا تو بنکاک کی وجہ شہرت سمجھ میں آ گئی۔ جوش کہنے لگے یہ پیٹ پانگ شو ہے یا پنگ پانگ کا میچ ہو رہا ہے۔ ہالی وڈ سے کچھ اداکار آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ ایک ایکٹرس کہنے لگی ''دنیا میں اس قسم کے شو کہیں نہیں ہوتے۔ فحاشی اور کمال فن یکجا ہو گئے ہیں۔'' اس کے باوجود محترمہ نے بنظر غائر دیکھا اور اس کی جزیات سے محظوظ بھی ہوئیں۔ اسی بازار میں ایک دفعہ قتیل شفائی کے دوست ہندو شاعر ورمانی پھنس گئے تھے۔ لندن میں انہوں نے مجھے اور جوش کو کھانے پر بلایا۔

بنکاک کا ذکر چھڑا تو کہنے لگے"؟ایک مرتبہ میں بھی برا پھنسا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سیر کرتے کرتے ہم پیٹ پانگ پہنچ گئے۔ ایک دلال ہمارے پاس آیا اور البم کھول کر مساج گرلز کی تصاویر دکھانے لگا۔ پہلے تو میں اسے ٹالتا رہا لیکن جب وہ مکھی کی طرح پیچھے پڑ گیا تو میں نے بیوی کی طرف اشارہ کیا۔ کہنے لگا نو پرابلم! اس کے لئے الگ سے بندوبست کر دیتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور ہم سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

جوش چلے گئے تو ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ ان کی حس مزاح کے تو ہم شروع سے قائل تھے لیکن مہاراجہ کے ساتھ نوک جھونک بڑی دلچسپ ہوتی۔ مہاراجہ کی عادت تھی کہ ہر کسی کو پتر کہہ کر بلاتے۔ یہ واحد شخص تھے جنہوں نے اس سے پتا جی کہلوایا۔ جوش بھی واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ بنکاک نے محاورتاً ہی سہی، ہاتھ جوڑے تو استاد بادل نخواستہ تیار ہوئے۔ جب آئے تو سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ میں ایئرپورٹ پر انہیں لینے گیا۔ غالباً بلڈ پریشر کا اثر تھا کہ جیٹ لیگ اُترتے ہی کہنے لگے:

I will like to go back as early as possible.

مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں ایئرپورٹ سے ہی واپسی کا ٹکٹ نہ کٹوا لیں لیکن یہ کیفیت اس وقت تک رہی جب تک لاؤنج کے اندر تھے۔ باہر نکلے تو مست ہوا کا ایک جھونکا ہی انہیں سرشار کر گیا۔ جاتے وقت کہنے لگے کمال ہے۔ اتنی عمر ہوگئی ہے کبھی اس شرارتی شہر میں آنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ لندن اور روم میں کیا رکھا ہے۔ اس شہر کے تو روم روم میں انیائت ہے۔ کبھی بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ جوش نے درست ہی کہا تھا۔ سیام کے جغرافیے کی طرح اس کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے۔

جاپان اور ایران کے درمیان چین کے علاوہ سیام واحد ملک تھا جو ۱۹۴۲ء تک استعماریت سے بچا رہا۔ ایشیا کے تمام ممالک صید زبون شہریاری بنا دیے گئے لیکن اس برہم چاری نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیامی اپنے ملک کو بڑے فخر سے موانگ تھائی کہتے تھے جس کے لغوی معنی ہیں "آزاد لوگوں کی سرزمین"۔ بنکاک کی طرح سیام کا نام تھائی لینڈ ۱۹۳۹ء میں رکھا گیا۔ سیام ۱۳۵۰ء سے ہی ایک آزاد مملکت تھا جس کی سرحدیں دریائے یانگ سے جا ملتی تھیں۔ ہر چند کہ تھائی لوگوں کے خدوخال اور عادات واطوار کافی حد تک چین سے ملتی ہیں لیکن لسانی اور نسلی اعتبار سے یہ ایک الگ قوم ہے۔ تھائی لینڈ کے آزاد رہنے کی دو بڑی وجوہ یہ ہیں اولاً اس کے جنگل اس قدر دشوار گزار تھے کہ انہیں عبور کرنا اور ان میں چلنا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہ تھا اور دوسرے افغانستان کی طرح بڑی

طاقتوں کو برما، ملایا اور ہند چینی کے درمیان ایک بفر ریاست کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت جغرافیائی اعتبار سے تھائی لینڈ ہی پوری کر سکتا تھا۔ ۱۹۳۲ء تک سیام نہ صرف ایک آزاد ملک تھا بلکہ یہاں مطلق العنان شہنشاہیت قائم تھی۔ ۱۸۷۲ء سے یہاں پر چکری خاندان کی حکومت تھی۔ یہ خاندان ہر چند کہ طبعاً نرم خو تھا لیکن جب عوام نے حقوق مانگنے شروع کیے تو یہ بھی چکرا گئے اور اس طرح ۱۹۳۲ء میں ایک ہلکا پھلکا انقلاب برپا ہوا جس کی زد میں صرف ایک زخمی ٹانگ آئی جو اتفاقاً ایک جرنیل کی تھی۔ انقلابیوں نے شاہ پراجادیپک کو تو بحال رکھا لیکن اس کے اختیارات پر قدغن لگا دی۔

تھائی لینڈ کے بادشاہوں کی لمبی فہرست میں سب سے دلچسپ حکمران چولا ہنگ کولن (Chaulalong Kohln) تھا اس نے ۱۸۸۶ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک حکومت کی، یہ بیدار مغز حکمران تھا۔ اس کے زمانے میں ایل آئی پوسٹ آفس اور ٹیلی گراف کا نظام قائم ہوا۔ اس کی چوراسی بیویاں تھیں اور بچوں کی ایک فوج ظفر موج تھی جن کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ۳۶۲ تھی۔ اس کی کچھ بیویاں نہ صرف آپس میں بہنیں تھیں بلکہ ان میں چند ایک اس کی اپنی سوتیلی بہنیں بھی تھیں - اس پر ایک فلم "The king and I" بھی بنی ہے لیکن اس کا داخلہ تھائی لینڈ میں ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ شاہ پراجہ دیپک اس کا جانشین تھا۔ جب تھائی انقلاب کے بعد شاہ پراجا خود ساختہ جلاوطنی پر چلا گیا تو ملک کا انتظام چلانے کے لئے چالیس آدمیوں پر مشتمل ایک کونسل قائم ہوئی۔ کونسل کا ہر رکن پیپلز پارٹی کا رکن تھا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپانیوں نے تھائی لینڈ پر قبضہ کر کے کونسل کی چھٹی کرا دی۔

تھائی لینڈ میں آج جمہوریت ہے لیکن انگلستان کی طرح شاہ کی قدر و منزلت اسی طرح ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قائد انقلاب جرنیل کی وردی اُتار کر وزیر اعظم کا سویلین سوٹ پہن لیتا ہے۔ بادشاہ امور سلطنت میں مداخلت نہیں کرتا اور اس کی حیثیت ایک نیوٹرل امپائر کی سی ہے۔

شاہ راما اول نے بنکاک کے متعلق جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر اُلٹی نکلی ہے۔ مہاتما بدھ کے اس سچے پیروکار نے برمی حکمرانوں کے آئے دن کے حملوں سے تنگ آ کر ایودھیا کی جگہ ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام رتنا کوسین رکھا - اس کے لغوی معنی موتیوں والے بدھ کی سرزمین۔

آج راما اول نہیں ہے۔ بدھ کو مندروں میں قید کر دیا گیا ہے۔ موتی اپنی آب و تاب کھو کر بکھر گئے ہیں۔ بازاروں میں، گلیوں میں، کلبوں کے اندر۔ ہر محلہ ایک بازار حسن ہے، ہر قریہ ایک قحبہ خانہ، ہر تیور طوائفانہ، ہر چال معشوقانہ، ہر سوال

فقیرانہ ہے، شہر چار سو پھیل گیا ہے، ڈان مواتگ ایئرپورٹ سے لے کر سیلوم روڈ تک جگہ جگہ بلند و بالا عمارات، جدید پلازے اور نفیس ہوٹل بن گئے ہیں۔ سلے ہوئے کپڑوں کی غالباً سب سے بڑی مارکیٹ یہیں پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب کوریا نے بھی کان کھڑے کرنے شروع کر دیے ہیں۔ فیکٹریاں ہزار سوٹ ایک دن میں نکال دیتی ہیں۔ خوبصورت، بہترین سلائی اور مناسب قیمت۔ یہ کسب کمال ہے کہ امریکہ اور یورپ تک کو سوتی کپڑے تھائی لینڈ سے برآمد کیے جاتے ہیں۔ سڑکوں پر سڑکیں بچھی ہوئی ہیں جو شہر کو کسی حد تک جدیدیت کا رنگ بخشتی ہیں لیکن اب بھی جگہ جگہ فٹ پاتھ پر، چھابڑی والے، ریڑھی بان، خوانچہ فروش، سبیاں، مچھلی، شکر قندی بیچتے نظر آتے ہیں۔ اکثر و بیشتر مقامات عورتیں کام کرتی ہیں مرد ہاتھ بٹاتے نظر آتے ہیں۔

جوش کیا گئے میں نے بنکاک جانا چھوڑ دیا۔ ویسے بھی کورس اختتام پذیر تھا اور صبح شام پڑھنا پڑتا تھا۔ ایک دن راجہ کا فون آ گیا۔ خاصے ناراض لگتے تھے کہنے لگے بڑے افسوس کا مقام ہے تم نے ملنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اس ویک اینڈ پر ضرور آؤ۔ تمہیں بدھ کے مندر اور کوائی کا پل دکھائیں گے۔ جو بات وہاں جا کر دیکھنے میں ہے اتنا لطف فلم دیکھنے میں نہیں ہے۔

ہفتے کی صبح میں مہاراجہ کی دکان پر پہنچا تو وہاں دو پاکستانی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے اپنے ہم وطنوں سے ملو۔ مشتاق خان مگسی مظفر گڑھ سے آیا ہے۔ یہ بنکاک میں ہوٹل کھولنا چاہتا ہے۔ شہزاد Accor کمپنی میں منیجر فنانس تھا۔ فرانس کی یہ کمپنی دنیا میں چار ہوٹلوں کی دیکھ بھال کرتی ہے Sofitel, Novotel, Macquire سوفیٹل فائیو سٹار ہے۔ جبکہ باقی فور سٹار ہیں۔ شہزاد کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ بنکاک آنے سے پہلے وہ بغداد میں تعینات تھا۔ اپنی پوسٹنگ پر بڑا خوش تھا۔ عراق میں اس نے مشکل وقت گزارا۔ جب آنے لگا تو اس کی سیکرٹری نے اسے بتایا کہ صدام حکومت کی طرف سے وہ اس کی جاسوسی پر مامور تھی۔ صدام نے ہر غیر ملکی کے پیچھے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ اگر کوئی غلطی سے بھی اس کے خلاف بات کر دیتا تو شام تک کام تمام کر دیا جاتا۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ لاکھوں لوگوں کے قاتل کے متعلق اب بھی کچھ لوگ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اسے ایک اعتبار سے تاریخ کا جبر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اب بھی جب سکندر رومی، چنگیز خان، جولیس سیزر اور اٹیلا دی ہن کا نام آتا ہے تو لوگ ان کی عظمت کے زیادہ معترف ہوتے ہیں اور اس ظلم کو بھول جاتے ہیں جو انہوں نے فتوحات کے سلسلے میں بے بس اور بے قصور لوگوں پر ڈھایا اور کشتوں کے پشتے لگا

دیے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ شروع سے ہی ظلم سہنے کے عادی رہے ہیں اور اس کو تقدیر کا لکھا گردانتے ہیں۔

ٹیمپل آف دی گولڈن بدھا: وہ گیان جو کپل وستو کے شہزادے کو آج سے بائیس سو سال پہلے حاصل ہوا تھا آج بھی اس کے چہرے سے ہویدا ہے۔ یہاں وقت کی طنابیں کھنچتی نظر آتی ہیں۔ ماحول میں کچھ ایسا سکون اور طمانیت ہے جیسے بدھ نے ایک لمبی تپسیا کے بعد آنکھ کھولی ہو۔ تعیش اور بے حیائی کے اس وسیع سمندر میں یہ مندر پارسائی اور سچائی کے جزیرے نظر آتے ہیں۔ ان کی حدود میں قدم رکھتے ہی آدمی اپنی ساری کثافتیں باہر چھوڑ آتا ہے۔ بدھ کی تعلیمات کو قبول کرنے میں تھائی قوم کے مزاج کو بڑا دخل ہے۔ سیامی بنیادی طور پر بڑے نرم دل ہیں۔ دھیما پن، برداشت اور صبر و تحمل ان کی سرشت میں داخل ہے۔ جگہ جگہ بھکشو گیروا لباس پہنے گیان دھیان میں مشغول نظر آتے ہیں۔ گل حنا ان کی ہتھیلی سے نہیں بلکہ آنکھوں سے صاف مترشح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی شہر میں بے شمار مندر ہیں جو تھائی آرٹ اور کلچر کا بہترین شاہکار ہیں۔ معماروں نے جس محنت، مہارت اور جذبے کے ساتھ جو نقش و نگار بنائے ہیں وہ دیدنی ہیں۔ ان میں جگہ جگہ بدھ کی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد مہاراجہ ہمیں شاہی محل لے گئے۔ چونکہ عام آدمی محل کے اندر نہیں جا سکتا اس لئے باہر سے ہی نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ محل ہر لحاظ سے بکنگھم پیلس سے بہتر ہے۔ وہاں ٹکٹ خرید کر آدمی اندر جھانک سکتا ہے۔ یہاں صرف خواص کو اندر جانے کی اجازت ہے۔ مہاراجہ اس بات پر بڑا فخر کیا کرتے کہ وہ تین بار عالم پناہ کے چرنوں میں بیٹھ چکے ہیں۔ ساتھ ہی دبے لفظوں میں اس زر کثیر کا ذکر بھی کرتے جو نذر شاہ کرنا پڑتی ہے۔ شاہ سے ملاقات کے وقت خاص لباس پہننا پڑتا ہے جو سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ البتہ شاہی خاندان کے کسی فرد کی وفات کے وقت سیاہ لباس پہنا جاتا ہے۔ میت کو ایک خاص مقام پر دیدار کے لئے رکھا جاتا ہے۔ وہاں صرف تھائی جا سکتے ہیں۔ البتہ چڑھاوا وہاں بھی چڑھانا پڑتا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق روحیں بھی خوراک مانگتی ہیں۔

برج آن دی رور کیوائی: مندروں سے نکلے تو مہاراجہ ہمیں دریائے کیوائی کا پل دکھانے لے گئے۔ یہ بنکاک سے اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ دریائے کوائی بھی کوئی خاص بڑا نہ تھا۔ پل بھی عام پلوں جیسا تھا لیکن اس کے ساتھ انسانی جذبات، احساسات اور انا کی ایک تاریخ جڑی ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں اسے برطانوی جنگی قیدیوں نے بنایا تھا۔ جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ دن رات

ان سے مشقت کرواتے حتیٰ کہ افسروں کو بھی مزدوری پر مجبور کیا گیا۔ برطانوی یونٹ کمانڈر نے انکار کر دیا۔ جب جاپانی کرنل نے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔ یہ اصولوں کا معاملہ ہے۔ اس پر جاپانی کرنل اسے زناٹے دار تھپڑ مارتے ہوئے بولا Bloody fool, This is war and not the game of cricket فوجی نکتہ نظر سے وہ بڑا اہم تھا۔ وہ برما کو تھائی لینڈ سے ملاتا تھا اور اسلحے کی ترسیل اسی ذریعے سے ہوتی تھی۔ وہ طوہاً و کرہاً تیار ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی برطانوی کرنل کو اس شاہکار سے محبت ہو گئی۔ جب برطانوی فوج نے اسے بم سے اُڑانے کی کوشش کی تو حیران کن طور پر اس کرنل نے مزاحمت کی اور جب پل گرا تو وہ بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ہم کافی دیر تک پل پر پھرتے رہے۔ سارے دن میں غالباً ایک ٹرین گزرتی تھی۔ مہاراجہ نے ہمارے فوٹو کھینچے۔ جب تھک گئے تو مگسی نے کہا ''مہاراجہ صاحب! اب ذرا جیب کو تھوڑی سی ہوا کھلوائیں۔ کچھ پیٹ پوجا ہو جائے۔''

ہنس کر بولے ''اس کا انتظام میں نے پہلے سے کر رکھا ہے۔ وہ ہمیں ایک خان صاحب کے ڈیرے پر لے گئے۔ سرخ و سفید رنگت کا ایک بوڑھا شخص پلنگ پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مہاراجہ نے ہمارا تعارف کرایا تو بڑا خوش ہوا۔ وہ تقسیم سے قبل یہاں آیا تھا اور ایک بہت بڑی جاگیر خرید لی تھی۔ زمینداری کرتا تھا اور خاصا خوش حال لگتا تھا۔ اس نے چائے اور بسکٹوں سے ہماری تواضع کی۔

کوالالمپور: پاکستان آنے سے پہلے میں ملائیشیا گیا۔ ۱۹۸۴ء کا ملائیشیا آج کے ملک سے بالکل مختلف تھا۔ کوالالمپور شہر جس کے معنی گدلے پانی والے دریاؤں کی سرزمین کے ہیں بالکل لاہور کی طرح تھا۔ پرانی عمارات، بازاروں میں ریڑھیوں پر خیاری کا سامان اور شکر قندی بیچتے ہوئے لوگ۔ ٹوٹی پھوٹی ٹیکسیاں اور رکشے۔ ایئرپورٹ بھی مسکین صورت تھا۔ جہاز سے اتر کر بس پر سوار ہونا پڑتا تھا۔ جتنا فاصلہ پنڈی سے مری تک ہے قریباً اتنے ہی فاصلے اور اونچائی پر گیٹنگ ہائی لینڈ ہے۔ اگر فرق تھا تو اتنا کہ پنڈی سے مری تک بس سسکتی ہانپتی کانپتی ہوئی چلتی تھی۔ ذرا سی چڑھائی پر اس کی رگیں تن جاتی تھیں۔ وہاں پوڈو کے بس اڈے سے لے کر دس پندرہ میل تک بس سروس تھی۔ اس کے بعد کیبل کار چلتی تھی۔ نہایت عمدہ اور آرام دہ۔ البتہ نیچے جنگل دیکھ کر جھرجھری آ جاتی۔ اس قدر گھنا جنگل کہ اگر تھالی پھینکیں تو وہ بھی درختوں کی چھتری میں اٹک جائے۔ نیچے حشرات الارض کی پوری فوج۔ Pantheon جو گائے کے بچھڑے تک کو نگل جاتے ہیں۔ کیبل کار سیدھی کیسینو میں جا پہنچتی ہے۔ کیسینو میں داخل ہونے کے لئے ملائیشیا کا

پھولدار چغہ پہننا پڑتا ہے جو باہر کے اسٹال پر بکتا تھا۔ گیمبلنگ کی اجازت بھی صرف غیر ملکیوں اور غیر مسلموں کو تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس کے مالک نے تفریح کا اچھا خاصا انتظام کر رکھا تھا۔ تین ہوٹل، ایک گہری نیلے پانیوں والی جھیل، ڈزنی لینڈ کی طرز پر Joy Rides باقی عیاشی کا انحصار آپ کی ہمت، حوصلے اور جیب پر ہے۔ کیبل کار کے علاوہ ٹیکسی سروس اور ہیلی کاپٹر سروس بھی ہے۔

۱۹۹۷ء میں مجھے پھر جانے کا اتفاق ہوا۔ شہر نے اپنی جون بدل ڈالی تھی۔ لاہور چھوڑ کراچی تک اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے نظر آتے۔ سو منزلہ عمارات، مین ہٹن کی طرح Glass Boxes نہیں بلکہ ہر عمارت کا منفرد ڈیزائن جس میں اسلامی طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہمیں کنکارڈ ہوٹل کی ستائیسویں منزل پر ٹھہرایا گیا۔ کھڑکی سے جھانکتے تو یوں لگتا جیسے تہہ خانے میں ہوں۔ کارخانوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ خواندگی سو فیصد، بے روزگاری زیرو پرسنٹ، دنیا کی ہر کمپنی نے کارخانے لگا رکھے ہیں اور اپنے دفاتر قائم کیے ہیں۔

یہ سب کچھ معجزاتی طور پر کیسے ہو گیا۔ ایوب خان کے زمانے میں آ کر وہ ہماری ترقی کا راز پوچھتے تھے۔ مہاتیر محمد نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ شہر کی مسجدیں قابل دید ہیں لیکن ڈیڑھ اینٹ والی مسجد بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر ایک خدا کے سامنے سربسجود ہونا ہے تو پھر تفرقہ اور تفریق کیسی۔ سلطان کا محل عظمت گم گشتہ کا امین ہے۔

بیک ٹو دی پویلین: جب بلے باز بیٹنگ کر کے واپس پویلین میں آتا ہے تو اس پر دو قسم کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ اگر سنچری و نچری بن جائے یا ٹلے لگ جائیں تو خوشی سے بلے کو ہوا میں لہراتا ہے۔ بالفرض صفر پر ہی کلی اُڑ جائے تو پھر رانی کھیت زدہ مرغے کی طرح گردن ڈھلک جاتی ہے۔ ہم گو سنچریں تو نہ بن سکے لیکن ایک کامیاب اننگ کھیل کے لوٹے تھے۔ ہمارے پاس تجربات و مشاہدات کا نہ صرف قابل ذکر سکور تھا بلکہ ایک عدد سند اور چند خوشگوار یادیں بھی سمیٹ لائے تھے۔ واپس پہنچے تو ماحول خاصا بدلا ہوا تھا۔ سجاد الحسن معتوب ہو کر ممبر بورڈ آف ریونیو لگ چکے تھے۔ ہمارا تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ ممتاز جوئیہ ہماری کھڑاویں رکھ کر نہیں بلکہ اپنی تشریف رکھ کر راج سنگھاسن پر بیٹھے تھے۔ ہمیں او ایس ڈی بنا دیا گیا تھا۔ خاصا اطمینان ہوا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد بغیر چھٹی لئے چھٹیوں کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

لیکن یہ کیف آور لمحات زیادہ دیر تک شاد کام نہ کر سکے۔ الطاف حسن قریشی جب گورنر جیلانی صاحب کو ملنے گئے تو انہیں تحفتاً ہماری کتاب ''اجنبی اپنے دیس میں'' پیش

کی- پتہ نہیں انہوں نے وہ کتاب پڑھی تھی یا عنوان دیکھ کر ہی ہمیں بلا لیا- ہم الطاف صاحب کو لے کر گورنر ہاؤس پہنچے تو وہ لان میں چھتری تلے بیٹھے آرام فرما رہے تھے- میری ان سے پہلی ملاقات تھی- ہاتھ ملاتے ہی بولے Shaukat you are a great writer مجھے تعجب اس لئے نہ ہوا کہ بلوچستان ہمارے فوجیوں کی کمزوری ہے- ہر قابل ذکر افسر کو وہاں ٹریننگ کے لئے جانا پڑتا ہے اور کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس علاقے کی Vastness & Wilderness سے متاثر نہ ہوا ہو- کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں- وہ نہ صرف بلوچستان پر میری معلومات سے متاثر نظر آتے تھے بلکہ اپنے تجربات بتا کر ہمیں مستفیض بھی کرتے رہے- آخر میں انہوں نے ایک ایسی بات کہہ دی جس کی کم از کم مجھے توقع نہ تھی- کہنے لگے Since you have come back, where would you like to be posted? مجھے اسلم خان اور صدر ضیاء الحق کے برادر نسبتی ڈاکٹر بشارت الٰہی نے بتایا تھا کہ جنرل جیلانی پی سی ایس افسروں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کر چکے ہیں - دراصل سی ایس پی افسروں نے یہ کہہ کر ان کے کان بھرے تھے کہ جس طرح فوج میں رینکرز ہوتے ہیں اسی طرح سول سروس میں پی سی ایس افسروں کو شمار کیا جاتا ہے- یہ بات اتنی بار ان کے کان میں ڈالی گئی کہ Rankers & Rancor کے الفاظ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے

میں نے کہا اگر آپ نے کچھ کرنا ہی ہے تو اس مظلوم سروس کے لئے کچھ کریں- مارشل لاء دور میں بھی اگر ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوا تو پھر کب ہوگا؟

حیرانی کے عالم میں انہوں نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور کہنے لگے:

These are the hazards of service, unless you change the structure of service, things will not improve.

عرض کیا "یہ سروس سٹرکچر کون بدلے گا- اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دیا ہے- یہ نیک کام کر ڈالیں-" الطاف حسن قریشی نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی-

زچ ہو کر بولے "Ok, Ok" پھر فون اُٹھا کر چیف سیکرٹری کو کہا "شوکت میرے پاس بیٹھا ہے یہ جہاں کہے اسے وہاں پوسٹ کر دو-"

جب ہم اٹھے تو وہ ہمیں گاڑی تک چھوڑنے آئے- ان دنوں میرے پاس ایک پرانی گاڑی LER 40 تھی- جنرل صاحب نے گاڑی کا دروازہ کھولا- میں خود ڈرائیو کر رہا تھا- راستے میں الطاف حسن قریشی کہنے لگے "یار! گورنر نے تمہاری بڑی عزت

افزائی کی ہے۔ میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ اتنے جونیئر افسر کے لئے کسی گورنر نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہو۔"

عرض کیا "آپ نے ان کی باڈی لینگویج پر غور نہیں کیا۔ پی سی ایس افسروں کے متعلق میں نے جو باتیں کی ہیں وہ انہیں پسند نہیں آئیں۔ کتاب کا مصنف ہونا ایک بات ہے۔ پی سی ایس افسر کا طوق گلے میں پہننا الگ مسئلہ ہے۔" قریشی صاحب نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

چیف سیکرٹری سے ملاقات: دوسرے دن صدیق چوہدری چیف سیکرٹری کو ملا تو وہ پھنکار رہا تھا۔ جھاگ کی صورت میں اُٹھتا ہوا تعفن اور اس کا خبث باطن رالوں کی صورت میں اس کی باچھوں سے باہر نکل آیا تھا۔ کوئی شخص جنرل جیلانی کو اس کی اجازت کے بغیر ملے یہ اس کو ہرگز قبول نہ تھا۔ تلملا تو ضرور رہا تھا لیکن فی الوقت کر کچھ نہیں سکتا تھا۔

بغیر تمہید کے بولا "کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"کوئی خاص پوسٹ میرے ذہن میں نہیں ہے۔ میں صرف لاہور رہنا چاہتا ہوں۔"

خشونت سے بولا "لاہور میں ایسا کون سا چارم ہے؟" لفظ چارم پر جب اس نے خاصا زور دیا تو اس کا خبث آنکھوں سے بھی جھانکنے لگا۔

کہنے کو تو میں بھی کہہ سکتا تھا کہ لاہور میں وہی لطف ہے جو تمہیں روز گلبرگ 111 کے مکان K5 میں ملتا ہے۔ یہ اس سلسلے میں خاصا بدنام تھا اور بوڑھی عمر میں اس کے معاشقے کا ذکر زبان زد خاص و عام تھا۔ اگر بلاخوف تردید کسی شخص کو سول سروس کا راسپوتین کہا جاسکتا تو وہ یہ ذات شریف تھے لیکن ایسی باتوں کو دل میں تو دہرایا جا سکتا تھا لب پر لانا قرین مصلحت نہ تھا۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ ایک ایس پی کا صدر ایوب سے تعارف کراتے ہوئے امیر محمد خان نے کہا تھا کہ عنقریب اس بلڈاگ کو وہ ظہور الٰہی پر چھوڑے گا۔ انسان چاہے جیسا بھی ہو جب گورنر ہاؤس میں پہنچتا ہے تو مزاج ایک جیسا ہو جاتا ہے۔ جنرل جیلانی نے اس کو خاص مقصد کے لئے رکھا ہوا تھا۔

چیف کارپوریشن آفیسر: قصہ مختصر میرا تقرر بطور چیف کارپوریشن آفیسر لاہور کر دیا گیا۔ چیف سیکرٹری نے احتیاطاً میئر لاہور کارپوریشن میاں شجاع الرحمٰن کو خبردار کر دیا۔ میاں صاحب سے میری شناسائی نہ تھی لیکن سن رکھا تھا کہ دھیمے مزاج کے شریف انسان ہیں۔ کارپوریشن مجسٹریٹ ذوالفقار علی طور کے ساتھ جب انہیں ملنے گیا تو ان کا رویہ کچھ عجیب سا لگا۔ خوش آمدید تو کیا کہنا تھا اُلٹا مجھے تنبیہ کرتے ہوئے بولے۔ دیکھ لیں یہ کارپوریشن ہے۔ یہاں سینکڑوں جائز ناجائز کام کرنے پڑتے ہیں۔ اکثر ممبر منہ پھٹ اور کچھ ہتھ چھٹ بھی ہیں۔ ان کے ناز

نخرے اُٹھانے پڑتے ہیں۔ اسی دوران ان کا ٹی او قیوم بزاخفش کے انداز میں تائیداً گردن ہلاتا رہا۔ احتیاطاً سی او سلیم کمبوہ کو بھگا دیا تاکہ چارج لینے کی نوبت ہی نہ آئے۔ پہلی ملاقات میں اس قسم کی باتیں ناقابل فہم تھیں اور انہیں ہضم کرنا کارِدارد۔ یہ سب باتیں میرے دو ماتحتوں کی موجودگی میں سنائی جارہی تھیں۔ میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا ''میاں صاحب میں نے آپ کی بڑی تعریف سن رکھی تھی لیکن سچ پوچھیں تو مجھے مایوسی ہوئی ہے۔ جہاں تک جائز کام کا تعلق ہے آپ تسلی رکھیں ایسا ہی ہوگا۔ ناجائز کام میں نہیں کرتا اور نہ کسی کو کرنے دوں گا۔'' یہ سن کر ان کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ پسینے کے چند قطرے ماتھے سے ڈھلک کر ناک کے پھندے پر گرنے لگے۔ ان کے نفس ناطقہ ٹریژری افسر قیوم نے ہونقوں کی طرح کھانسنا شروع کردیا۔

بولے ''اس صورت میں آپ چارج نہیں لے سکتے۔''

''کیا یہ کارپوریشن آپ کی زرخرید ہے یا آپ نے اس کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ آپ اپنا کام کریں اور مجھے اپنے فرائض سرانجام دینے دیں۔ میں ابھی جا کر چارج assume کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔''

میاں صاحب دوڑے دوڑے چیف سیکرٹری کے پاس گئے۔ اس نے گورنر سے ملنے کا مشورہ دیا۔ سیکرٹری لوکل گورنمنٹ امتیاز مسرور نے بھی بے بسی سے کندھے اُچکا دیے۔ گورنر نے بھی معذرت کی۔ مجھے فون پر صرف اتنا کہا ''میاں صاحب میرے پاس بیٹھے ہیں۔ شریف آدمی ہیں ان کا خیال رکھنا''

دوسرے دن الطاف حسن قریشی سے ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگے ''کیا ہوا ہے؟'' شام کو شجاع الرحمٰن میرے پاس آیا تھا۔ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا ''سی سی او مجھ سے ناراض ہوگیا ہے۔ اسے میرے گھر کھانے پر لے آؤ۔'' جب میں نے انہیں ساری بات بتائی تو خوب ہنسے۔

اس تناظر میں میں نے کام شروع کیا۔ لاہور کارپوریشن ایک بحرِ ذخار ہے جس میں مسائل کا انبار لگا ہوا تھا۔ نااہلی اور کرپشن یکجا ہوگئی تھیں۔ کونسلرز، شتر بے مہار کی طرح دفتروں میں دندناتے پھرتے اور عملاً اہلکار کا ہاتھ پکڑ کر فائلوں پر اپنی مرضی کے حکم لکھواتے۔ کئی یونینیں تھیں جو ہر وقت کام کرنے کی بجائے نعرہ بازی کرتی رہتیں۔ میئر بیسیوں کونسلرز کے جلو میں آتا اور سینکڑوں فائلوں پر بغیر پڑھے دستخط کر کے چلا جاتا۔ میز پر ہر وقت فائلوں کا انبار لگا رہتا۔ سینکڑوں چیک روز دستخط کرنا پڑتے۔

[جاری ہے۔]

غزل

ستم طرازِ فلک ، زخم آشنا بھی تو ہو
اُفق اُفق شفقِ درد کی حنا بھی تو ہو

خلا بہ پا ہُوں مگر دشت خاک بہ سر
کچھ اپنا آپ مٹانے کی انتہا بھی تو ہو

میں خاک بن کے فضا میں بکھر بکھر جاؤں
کسی کے پاؤں تلے زینۂ صبا بھی تو ہو

ہوس کی برف، بدن سے پگھل تو جائے مگر
شرر شرر کوئی پیکر کبھی چھوا بھی تو ہو

نظر نظر میں ہزاروں سوال ہیں لیکن
فلک سے کوئی مری سمت دیکھتا بھی تو ہو

نئی گھڑی ، نئے صحرا ، نئے اُفق لائی
کسی طرح حقِ آشفتگی اَدا بھی تو ہو

برہنگی مرا مذہب ، مرا سلوک سہی
مگر بدن پہ کسی قدر کی ردا بھی تو ہو

مری وفاؤں کی گہرائیوں کا کھوج تو لے
وہ بحرِ حُسن کبھی ظرف آزما بھی تو ہو

فقط بیانِ حقیقت نہیں ہے منزلِ حق
جہت شناس وہ ہے جو جہت نما بھی تو ہو

ترے سِوا بھی کسی کو کہوں ندیم ، مگر
"ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو"[1]

خالد احمد

---

(۱) ندیم

غزل

جاں لیوا وبا سے قسمت کی تاثیر بنانی ہوتی ہے
اس اپنے وطن کی مٹی سے اکسیر بنانی ہوتی ہے

ہم اپنے خون کی لرزش سے ہاتھوں کو مصور کرتے ہیں
ہر غم کی خام لکیروں سے تصویر بنانی ہوتی ہے

جذبات کی لہریں اُٹھ اٹھ کر کاغذ پہ تماشا بنتی ہیں
جب مجھ کو شکستہ لفظوں کی تحریر بنانی ہوتی ہے

ان جھوٹی سچی باتوں کے جذبات ہوئے ہیں جوش بھرے
اک آگ لگانے والی جب تقریر بنانی ہوتی ہے

ہر شعر میں بھر دوں حسنِ نظر ہر لفظ ہو گلشن زخموں کا
اس کیف میں مجھ کو اپنی غزل کشمیر بنانی ہوتی ہے

دامن میں خس و خاشاک بھروں چہرے پہ سفر کی گرد ملوں
اس طور سے مجھ کو کیوں ثاقب تقدیر بنانی ہوتی ہے

انصاف کی خاطر کون مرے دربار میں جا فریاد کرے
اپنی ہی جان کے ٹکڑوں سے زنجیر بنانی ہوتی ہے

آصف ثاقب

غزل

ساری درد کہانی کیا
پھر سے ہے دہرانی کیا!

ہر شے اپنی ضد سے ہے
آگ نہ ہو تو پانی کیا

جنت ، دوزخ ، اگلا پل
سب کچھ ہے اِمکانی کیا!

رونق ہو جو آنکھوں میں
منظر کی ویرانی کیا

خوش تہذیب ، نگاہوں کو
جسموں کی عریانی کیا

تنہائی سے صحرا تک
اپنی نقل مکانی کیا

دونوں روٹھے بیٹھے تھے
کرتی شام سہانی کیا

فن تھا کل بھی بے قیمت
ایسی تھی ارزانی کیا!

سب کا ایک ٹھکانا ہے
درویشی ، سلطانی کیا

جینا ، مشکل ہو جائے
ایسی بھی آسانی کیا

دشت لگے گا دریا سا
آنکھ میں بھر کر پانی کیا!

ساری دنیا ، چھان چکے
خاک دلوں کی چھانی کیا!

دن تھے سخت فقیروں کے
کرتی رات کی رانی کیا

چاہت اور تعلق کے
بدل گئے ہیں معانی کیا؟

امجد دور خلاؤں تک
پھیلی ہے حیرانی کیا!

امجد اسلام امجد

غزل

وہ کہتا ہے کہ ہر شے ٹھیک ہوتی جا رہی ہے
کوئی ہونی مگر نزدیک ہوتی جا رہی ہے

ترے بخشے ہوئے ان جگنوؤں کی روشنی سے
یہ شب کچھ اور بھی تاریک ہوتی جا رہی ہے

ہمارا حق بھی ملتا ہے ہمیں کن منتوں سے
کہ مزدوری بھی اپنی بھیک ہوتی جا رہی ہے

اُسے بزمِ عدو میں یوں سراہا جا رہا ہے
مرے اندر مری تضحیک ہوتی جا رہی ہے

زمانوں سے لگے ہیں غیر گہری سازشوں میں
اور اب اپنوں کی بھی تشریک ہوتی جا رہی ہے

محبت کا تقاضا ہے کہ ہے تیرا تصرف
ہماری جاں تری تملیک ہوتی جا رہی ہے

مجھے اچھا بہت لگنے لگا ہے اُس کا ایماں
اُسے پیاری مری تشکیک ہوتی جا رہی ہے

بیاں پر خود کلامی کا گماں ہونے لگا ہے
تمہاری گفتگو باریک ہوتی جا رہی ہے

حقیقت خوش نما لفظوں سے کب چھپتی ہے عالی
بہت پامال یہ تکنیک ہوتی جا رہی ہے

جلیل عالی

غزل

خرد کو راس ہے ازحد خموشی
جنوں نے کی ہمیشہ رد خموشی

نہیں بولے جہاں پر بولنا تھا
ہمی سے ہو گئی سرزد خموشی

لبِ اظہار پر پہرے بٹھا کر
بڑھا لیتی ہے اپنا قد خموشی

کٹہرے میں کھڑا ہوں اور چپ ہوں
'جوابِ جاہلاں باشد خموشی'

لپٹ کر مال و زر میں آ رہی ہے
برائے ممبر و مسند خموشی

زبانِ حق پہ تالے پڑ چکے ہیں
خموشی ہے کہ سو فیصد خموشی

قلم تصویر کرتا جا رہا ہے
بیاں کرتی ہے خال و خد خموشی

مرے آرام کے دن آگئے ہیں
ضروری ہے سرِ مرقد خموشی

کنور نروان حاصل کر رہا ہوں
ہے زیرِ سایۂ برگد خموشی

اعجاز کنور راجہ

غزل

[یوم آزادی کے تناظر میں]

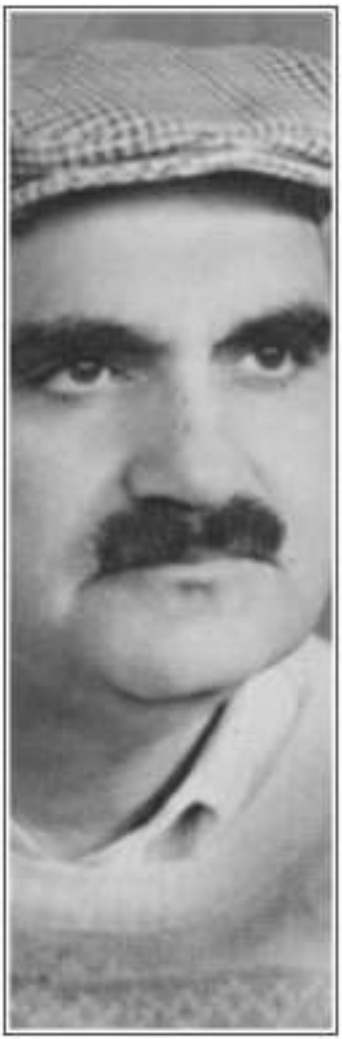

اک انقلاب مری خواہشوں سے پیدا ہو
اک آفتاب، مرے رتجگوں سے پیدا ہو

ہوائے شوق کسی دن تو اس طرح سے چل
گُلِ مراد، مرے آنگنوں سے پیدا ہو

دیارِ شام سے گزروں تو وہ مقام آئے
تری صدا کا گماں، آہٹوں سے پیدا ہو

مرے نگار اک ایسی شبِ وصال آئے
ترا وجود، مری دھڑکنوں سے پیدا ہو

میں اس کی موج میں ڈوبوں تو پھر اُبھر نہ سکوں
وہ لہر بھی کبھی تیری تہوں سے پیدا ہو

وہ بادبان ہو جس کو تری کماں کھولے
وہ بحر ہوں جو ترے پانیوں سے پیدا ہو

اُسی میں دہر کی رنگینیاں سمٹ آئیں
وہ حرفِ سادہ جو میرے لبوں سے پیدا ہو

جمیل یوسف

غزلیں

گماں یہ نہ کیجو، بڑا وقت ہے
کہ پھٹتا ہوا چیتھڑا وقت ہے
کبھی مان لیتا تھا باتیں مری
اور اب اپنی ضد پر اَڑا وقت ہے
یکا یک ہی اُس کی گھڑی رُک گئی
جو یہ کہہ رہا تھا، بڑا وقت ہے !
میں لاوقت ہوں اور مشکل میں ہوں
مرے راستے میں پڑا وقت ہے
کہیں ٹوٹ جانا تو ہے لازمی
کہ دریا میں کچا گھڑا وقت ہے
کوئی وقت بھی اتنا اچھا نہ تھا
مگر یہ بہت ہی کڑا وقت ہے

مری عمر کچھ اِتنی کم بھی نہیں !
مگر مجھ سے تھوڑا بڑا وقت ہے
مری قبر آدھی سی کھودی ہوئی
یہ چلتا ہوا پھاوڑا وقت ہے
لڑائی میں مَیں جیت سکتا نہیں
کہ میرا مخالف دھڑا وقت ہے
نسیمؔ اِس کا مصرف ہی کوئی نہیں
کہ دلدل کی تہہ میں پڑا وقت ہے

نسیمِ سحر

ترا مشورہ مان لوں مَیں؟
یہ کھوٹا، کھرا مان لوں مَیں؟
میں اپنی اکائی کو توڑوں؟
تجھے دُوسرا مان لوں مَیں؟
فضا میں جو تتلی ہے رقصاں
اُسے اپسرا مان لوں مَیں
بڑی جستجو چھوڑ دوں کیا؟
تجھے ماورا مان لوں مَیں؟

ستاروں سے خالی فلک کو
ستاروں بھرا مان لوں مَیں؟
یہ سُوکھا ہوا زرد پتّا
اسے کیوں ہَرا مان لوں مَیں؟
جو ابلیس کہتا ہے مجھ سے
بتا، داورا ، مان لوں مَیں؟

غزل

خود کو جتنی اُڑان میں رکھنا
لوٹنا بھی ہے، دھیان میں رکھنا

کیا خبر کب ہدف نظر آئے
تیر پیہم کمان میں رکھنا

آندھیاں کب سے ان کی تاک میں ہیں
مشعلوں کو امان میں رکھنا

ہم نے چاہا مگر نہ تھا ممکن
دھوپ کو سائبان میں رکھنا

قرب ڈھل جائے گا جدائی میں
فاصلہ درمیان میں رکھنا

حل طلب ہیں ابھی سوال بہت
ذہن کو امتحان میں رکھنا

دل نہ دشمن کا بھی دُکھے گلزار
بات ایسی بیان میں رکھنا

گلزار بخاری

غزل

کئی تقاضے تھے قلب و نظر کے بھول گیا
میں زندگی میں بس اک عشق کر کے بھول گیا

ہوا کی سانس بھی پہروں رُکی رہی کل رات
چراغ میں بھی ہتھیلی پہ دھر کے بھول گیا

کہاں تلاش کروں گمشدہ محبت کو
میں یہ خزانہ کہیں دفن کر کے بھول گیا

مجھے خبر تھی کہ اب نیند پھر نہ آئے گی
میں گہرے خواب میں اک شب اُتر کے بھول گیا

وہ چھت جو سر پہ تھی اب تک اسے بھلا نہ سکا
تو پھر میں کیوں در و دیوار گھر کے بھول گیا

اگرچہ شہد گھلا تھا کسی کی باتوں میں
مگر میں زہر کے دو گھونٹ بھر کے بھول گیا

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیوں بے کسی سے دیکھ رہے ہو فلک کی سمت
رستے نجات کے نہیں رستے فرار کے

غزلیں

پھر دھواں سا تو ہر اِک روزنِ در سے اُٹھا
ایک شعلہ سا مگر شیخ کے گھر سے اُٹھا

اُس نے آئین معطل کیا بیٹھے بیٹھے
کوئی بھی شخص اِدھر سے نہ اُدھر سے اُٹھا

کوچۂ شعر میں بیٹھا تو ہُوں مَیں میر کے پاس
پر مرا شور مرے اپنے ہنر سے اُٹھا

جب بھی اُٹھا ہے کہیں حشر کا فتنہ یارو
زاہدِ خشک کے ہی دامنِ تر سے اُٹھا

ذہن سے جھٹکی جونہی خواہشِ دُنیا خاورؔ
یوں لگا بوجھ سا کوئی مرے سر سے اُٹھا

خاور اعجاز

اِک شخص کی طلب ہے ہمیں، سارا جگ نہیں
دُنیا ہمیں خلوص کے رستے میں ٹھگ نہیں

تجھ میں اگر ہنر ہے تو روشن ہو دہر میں
اے شمعِ زندگی! یونہی خُود میں سلگ نہیں

دم لیجیے نہ منزلِ آخر سے پیشتر
رستہ طویل ہے کوئی دو چار پگ نہیں

دِل تھا جڑا ہُوا کبھی سینے میں اور اَب
انگشتری تو ہے مگر اِس میں وہ نگ نہیں

لَو دے رہی ہے اَب بھی وہی شمعِ رہبری
ہم روشنی سے، روشنی ہم سے الگ نہیں

غزل

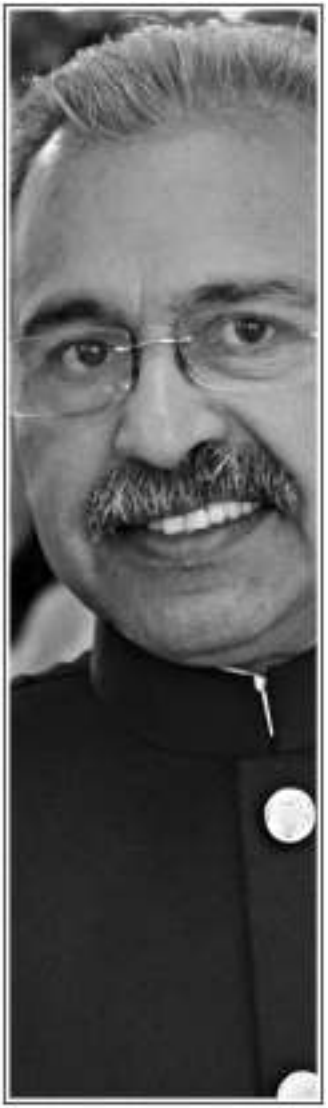

کہنی تو ضروری نہیں ہر بات سمجھ لے
صورت سے مری صورتِ حالات سمجھ لے

بہروں میں بھی ممکن ہے کوئی بات سمجھ لے
مجھ پر جو اتاری گئیں آیات سمجھ لے

ہم جیسوں کو مرنے سے بچانے کے بہانے
احباب نے کی ہیں جو عنایات سمجھ لے

پارے کی طرح ٹوٹ کے جڑ جاتا ہوں پھر سے
بے شک تو اِسے میری کرامات سمجھ لے

تسکین نظر کو تو بہت کچھ ہے ترے پاس
وہ آنکھ نہیں جو مرے جذبات سمجھ لے

ہر ایک پہ کھلتے نہیں بت خانوں کے رستے
مجھ سے یہ کمالات و طلسمات سمجھ لے

پھر بعد میں دریاؤں کے نغمات سنانا
پہلے ذرا صحراؤں کے حالات سمجھ لے

اُن بھیگتی آنکھوں میں بھی پیغام وہی تھا
ہر چھت پہ سناتی ہے جو برسات سمجھ لے

قبضے میں وڈیروں کے زمینیں ہیں تو راحت
تو صحن کے پودوں کو ہی باغات سمجھ لے

راحت سرحدی

غزل

سید قاسم جلال

جب اُن سے حال سُنا سب ملال بھول گئے
ملا جواب کچھ ایسا سوال بھول گئے

ابھی تو قرض چکانا ہے ان کو مٹی کا
یہ بات کیوں میری دھرتی کے لال بھول گئے

گِلہ تمہی سے نہیں سب کا یہ وتیرہ ہے
ملا عروج تو دور زوال بھول گئے

عجیب بات کہ اوروں کے جو مسیحا تھے
خود اپنے زخم کا وہ اندمال بھول گئے

ہر اِک نے اپنے مسائل کا حل تلاش کیا
مرا خیال ، مرے ہم خیال بھول گئے

ہوئی ہیں اب کے عجب بدحواسیاں طاری
شکار کرنے چلے اور جال بھول گئے

دکھا رہے ہو یہ کن پتھروں کو آئینہ
ارے جلالؔ زمانے کی چال بھول گئے؟

غزل

ثوابوں کی ہے گلکاری
خدا خوفی، روا داری

وہ جس میں استقامت ہے
مقابل پر رہا بھاری

بچت میں سُود مندی ہے
خسارہ ہے زیاں کاری

جبیں جھکتی نہیں بے جا
خدا دے دے جو خودداری

وہ سر اَفراز رہتے ہیں
جنھیں عزّت رہے پیاری

تناؤ سے بچے رہنا
اِسی میں ہے سمجھداری

کہاں ممکن ہے بچ رہنا
جو راشد وار ہو کاری

ممتاز راشد لاہوری

غزل

جہاں ہوتا تھا ذکرِ خاص رومانی فضاؤں کا
وہاں اب تذکرہ رہتا ہے جاں لیوا وباؤں کا

یہ دنیا ایک کچا گھر، اترنا ہے زمیں اندر
وہاں پکی رہائش ہے، نہیں دھڑکا فناؤں کا

حدودِ شرف میں رکنا پڑا، بھٹکی اداؤں کو
ہمیں ممنون ہونا ہے کرونا سی وباؤں کا !

بڑا پر پیچ ہے کارِ جہاں، کھلتی نہیں راہیں
یہاں پہ زندگی کرنا، مٹانا ہے اناؤں کا

بلا جنگ و جدل مردہ کیا ہے جن بلاؤں نے
ہمارے بعد بھی چرچا رہے گا ان وباؤں کا

مجھے وینس نگر میں گھر بسانے کی تمنا تھی
بہت سنتی تھی اس کے دیس میں شہرہ وفاؤں کا!

فرخندہ شمیم

غزلیں

نگاہِ نم میں طوفانوں کا منظر رقص کرتا ہے
بھنور میں ساتھ اپنے تو سمندر رقص کرتا ہے

ہمیں تو خرقہ پوشی راس آئی ہے جہاں والو!
ہُما، ورنہ فقیروں ہی کے سر پر رقص کرتا ہے

تصور میں لیے ہر دم، کوئی مہتاب سا چہرہ
سرِ دشتِ جنوں اک خاک پیکر رقص کرتا ہے

نگاہِ مست سے پیتے ہیں، محوِ رقص رہتے ہیں
زمانہ بھی ہمارے ساتھ، اکثر رقص کرتا ہے

غرورِ حسن سے کوئی، ہواؤں میں اُڑے ایسے
کہ جیسے شاخِ گُل پر، اک گُلِ تر رقص کرتا ہے

سکندر اپنی شوکت پر، پریشاں آپ ہے، لیکن
قلندر مسکراتا ہے، قلندر رقص کرتا ہے

کسی کے عشق کا اعجاز شوکت، اس کو کہتے ہیں
دِوانوں کی طرح کوئی جو در در رقص کرتا ہے

شوکت محمود شوکت

محبت کی فسوں کاری، سرِ بازار می رقصم
محبت ایک بیماری، سرِ بازار می رقصم

اِدھر ڈوبے ذرا سورج، اُدھر وہ یاد آ جائے
پریشاں رات ہو ساری، سرِ بازار می رقصم

میں مٹّی ہوں، مجھے تو چاک پر گردش میں رہنا ہے
وہ نوری ہو کہ ہو ناری، سرِ بازار می رقصم

چھپا کر دل میں سیلِ غم، تبسّم لب پہ رہتا ہے
بڑھے جب گریہ و زاری، سرِ بازار می رقصم

سرِ دشتِ جنوں، مجنوں تو محوِ رقص رہتا تھا
ہے مجھ پر بھی جنوں طاری، سرِ بازار می رقصم

نبھائے کب حسیں کوئی، یہاں مخلص نہیں کوئی
ہوئی عنقا وفاداری، سرِ بازار می رقصم

میں کھینچوں رنجِ مہجوری، رہوں ماتم کناں شوکت
ہے فطرت میں عزاداری، سرِ بازار می رقصم

غزلیں

کون تھے؟ غیر نہ تھے، اپنے ہی ماں جائے تھے
یوں مرے شہر پہ اپنوں نے ستم ڈھائے تھے

ہم جہاں رہتے تھے وہ شہرِ نگاراں تھا کبھی
ہم اسی شہر سے با دیدۂ نم آئے تھے

وہ اندھیرا تھا کہ دم توڑ چکے تھے سارے
لوگ اُس شہر کے جگنو بھی چُرا لائے تھے

ایک اک کر کے بُجھے جاتے تھے روشن تارے
کتنے ہی چاند مرے شہر کے گہنائے تھے

ٹاٹ کی اوٹ سے اب کون پکارے گا ہمیں
رفتگاں رضوی سبھی یاد بہت آئے تھے

منفعت عباس رضوی

کس کی قسمت میں غم نہیں ہوتے
غم چھپانے سے کم نہیں ہوتے

اک زمانہ تھا خون روتے تھے
اب تو دامن بھی نم نہیں ہوتے

اور پھر جب نگاہ ملتی ہے
تم تو ہوتے ہو ہم نہیں ہوتے

ہم تو دریا کے دو کنارے ہیں
اور کنارے بہم نہیں ہوتے

تم نے آنکھوں سے جو کیے شکوے
وہ سپردِ قلم نہیں ہوتے

ہم وہ خود سر ہیں جن کے سر رضوی
کٹ تو جاتے ہیں خم نہیں ہوتے

غزل

قربتوں کے دلربا گزرے زمانے یاد کر
نت نئے ملنے ملانے کے بہانے یاد کر

ہاں وہی مستی میں ڈوبے دل نوا شام و سحر
ہاں وہی جام و سبو وہ بادہ خانے یاد کر

بچپنا مٹی کی خوشبو بارشوں کی شوخیاں
خواب، جگنو اور گڑیوں کے فسانے یاد کر

گاؤں کے اک بوڑھے برگد کی گھنیری چھاؤں میں
مل کے جو گاتے تھے وہ نغمے پرانے یاد کر

یاد تو ہو گی سمندر کی کہانی آج بھی
نام لکھ کر بر لبِ ساحل مٹانے یاد کر

قرب کے لمحات میں میری کسی بھی بات پر
مجھ سے یونہی روٹھ جانے کے بہانے یاد کر

میں فقط ہوں اپنے ناکردہ گناہوں کا اسیر
تو بھی تو تیرِ نظر کے وہ نشانے یاد کر

بیتے لمحوں کو کبھی آواز دے اقبال تو
بھیگی بھیگی سی رُتیں، منظر سہانے یاد کر

اقبال سروبہ

غزل

تاثیر نقوی

سکوتِ شب میں جب دیکھوں تو ہر سو تو نظر آئے
کہ جیسے میرے آنگن کی طرف شمس و قمر آئے

یہاں تاریکیوں کا راج ہے جس سمت بھی دیکھوں
گلوں کی آرزو صحنِ گلستاں میں سحر آئے

کرو گے کام جو اچھے ملے گا اجر بھی اُس کا
وسیلہ ان کا ہو تو پھر شفاعت کی خبر آئے

عمل ہوتا نہیں لیکن نمائش ساتھ چلتی ہے
دعا یہ ہے کہ اپنا بھی کوئی تو راہبر آئے

یہاں پر نفسانفسی کا عجب عالم نظر آیا
کسی جانب سے تو اپنے لیے کوئی خبر آئے

نظامِ زیست کے ہمراہ چہرے بھی بدل ڈالو
مری خواہش ہے کہ میری دُعاؤں میں اثر آئے

خزاں کے بعد آئے گا بہاروں کا زمانہ بھی
گلستاں میں کوئی، تاثیر ایسی بھی خبر آئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر مجھ کو چراغوں نے ٹھہرنے نہ دیا
میں وہ لَو تھا جسے سورج نے اُبھرنے نہ دیا

غزل

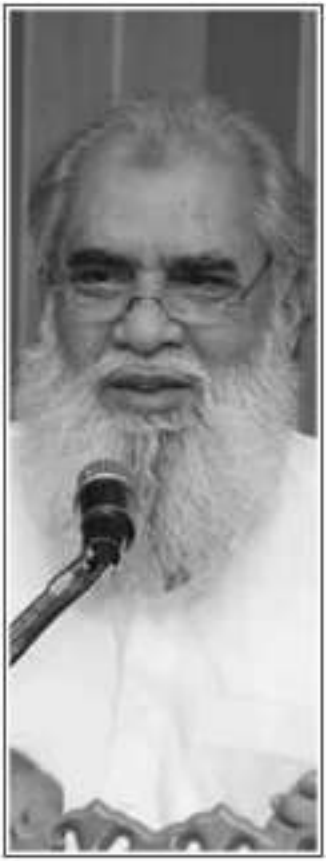

بہت مغرور ہے اور اس کے دل میں گھر بھی کرنا ہے
جو چوٹی سب سے اونچی ہے اسی کو سر بھی کرنا ہے

ابھی اس کو سبق دینا ہے میں نے چالبازی کا
ابھی اندر کے اِس انسان کو خود سر بھی کرنا ہے

نپٹ لیں پہلے ان تھوڑے سے پیادوں اور سواروں سے
تو اک بھرپور حملہ پھر ہمیں شہ پر بھی کرنا ہے

اسے کچھ رام کرنا اور کچھ خود رام ہو جانا
بگاڑا ہے تعلق تو اسے بہتر بھی کرنا ہے

ابھی کچھ دن لگیں گے مجھ کو اکرم گھاگ ہونے تک
ابھی پہلا سبق ہے اور اسے ازبر بھی کرنا ہے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

شاہنواز زیدی

تیرے چہرے سے شروع، اور ترے چہرے پہ تمام
میری تصویر کشی، گائیکی اور میرا کلام

تیری تخلیق سے ظاہر ہے کہ تو ہے موجود
نامور ہوں تو مصور کبھی لکھتے نہیں نام

مجھے دے دے لب پیمانہ ابھرتا مہتاب
اور درِ یار کی دہلیز پہ جھکتی ہوئی شام

اسپِ خوددار سے سیکھو مرے محبوب کے ناز
زردۂ گل سے اٹھاؤ مرے پی کے پیغام

حرف رہ جاتے ہیں، مفہوم بدل جاتے ہیں
آنکھ والوں کو تو کافی ہے ترا جلوۂ عام

موت کے بعد اگر بن نہیں سکتا واحد
کیسے ممکن ہے کہ مل جائے مجھے عمرِ دوام

روز شاخوں پہ نئے پھول نکل آتے ہیں
نئے آغاز سے ہوتا ہے پرانا انجام

غزل

وقت مشکل ہے، ٹالیے صاحب
اچھی یادیں سنبھالیے صاحب

جو سمجھتے نہیں زباں دل کی
گھاس اُن کو نہ ڈالیے صاحب

منتظر کب سے چاک پر ہم ہیں
ہم کو مورت میں ڈھالیے صاحب

جو محبت کی سمت جاتا ہو
ایسا رستہ نکالیے صاحب

آپ کے ایک رنگ میں مل کر
ہم نے سب رنگ پالیے صاحب

وقت کی دھوپ میں جلی آنکھیں
پھر بھی سپنے بچا لیے صاحب

شاید اس بار جیت جائیں ہم
پھر سے سکہ اُچھالیے صاحب

شبہ طراز

غزلیں

حسرت سے ہم بہ دیدۂ نم دیکھتے رہے
روکے نہ اس نے بڑھتے قدم دیکھتے رہے
لفظوں میں حُسنِ یار سمیٹوں تو کس طرح
حیرت سے مجھ کو لوح و قلم دیکھتے رہے
میرے علاوہ سب کی طرف دیکھتا تھا وہ
محفل میں شوق سے جسے ہم دیکھتے رہے
یہ اور بات خود نظر آئے نہ وہ کہیں
ہوتے رہے جوان کے کرم دیکھتے رہے
ٹوٹے ہیں آج پر، تو گرے ہیں زمین پر
اب تک بلندیوں کو ہی ہم دیکھتے رہے

احمد جلیل

کوئی سلسلہ کوئی رابطہ ہی نہیں رہا
مرا اس سے اب کوئی واسطہ ہی نہیں رہا
مرے چاروں اور یہ کس طرح کے حصار ہیں
مرے سامنے کوئی راستہ ہی نہیں رہا
میں بکھر گیا ہوں قدم قدم رہ یار میں
مری آرزوؤں کا قافلہ ہی نہیں رہا
مجھے بخش دے کبھی اس طرح کی بھی قربتیں
میں یہ کہہ سکوں کوئی فاصلہ ہی نہیں رہا
ترے شوق میں میں گزر گیا حدِ جان سے
مری جان اب کوئی مرحلہ ہی نہیں رہا

کرب و بلا میں شامِ غریباں کی اوٹ سے
نیزے پہ جو سجا تھا علم دیکھتے رہے
بکھری ہیں دور دور یہ خوابوں کی کرچیاں
اک ایک کر کے ٹوٹے بھرم دیکھتے رہے
جوں جوں نیاز مندیاں میری بڑھیں جلیل
بنتے گئے خدا وہ صنم دیکھتے رہے

تری دسترس سے نکل کے جاؤں گا میں کہاں
مری جان مجھ میں یہ حوصلہ ہی نہیں رہا
ترے بعد جذبے ہیں برف رُت کے حصار میں
مرے دل میں اب کوئی ولولہ ہی نہیں رہا
تو بھی بھول جا اُسے اب جلیل یہ سوچ کر
تری داستاں میں یہ واقعہ ہی نہیں رہا

غزلیں

درد کا کوئی نہ یاں درماں کرے
جو بھی آئے زخم کو عریاں کرے

زندگی بھی تو وفا کرتی نہیں
موت ہی سے یوں گلہ انساں کرے

میرے گلشن میں اُداسی چھا گئی
کوئی آئے بلبلیں رقصاں کرے

راستہ تو نے چنا ہے پُرخطر
تیری تکلیفیں خدا آساں کرے

وہ تو بیٹھا ہے ہوا کے دوش پر
کیا کوئی دل کا اسے مہماں کرے

زندگانی کے مسائل بڑھ گئے
کوئی ذکرِ کاکلِ پیاں کرے

بھیگے موسم میں لکھے غزلیں رضا
اور اُس کی یاد کو عنواں کرے

رضا اللہ حیدر

سوادِ گل میں ہے خوشبو براجمان ابھی
نہ باغ بیچنے کی باغبان ٹھان ابھی

ہمیں ٹھہرنا نہیں ہے گلاب سایوں میں
ہماری راہ میں باقی ہیں امتحان ابھی

کہاں وفاؤں میں سُرخی لہو کی شامل ہے
اسی لیے تو ادھوری ہے داستان ابھی

ہوائے تند مسلسل ہمارے در پے ہے
ہمارے پاؤں کے نیچے رہے چٹان ابھی

رضا یہ زینت و تزئیں چمن کی ہم سے ہے
جو چاہیں ہم تو پڑے پاؤں باغبان ابھی

غزلیں

ٹوٹتے رہنے کے آزار میں آجاتے ہیں
کتنے بھولے ہیں ترے پیار میں آجاتے ہیں

ماضی و حال کے سب زخم بھلاتے ہوئے ہم
دیکھ لیں تجھ کو تو سنسار میں آجاتے ہیں

سوچتے رہنے سے جنت نہیں ملنے والی
ہم ترے حلقہ آثار میں آجاتے ہیں

اپنے ہی دھیان میں ڈوبے ہوئے منزل کی طرف
کیوں سمندر میری رفتار میں آجاتے ہیں

ہم ہواؤں کی طرح خانہ بجاں پھرتے ہیں
کسی در میں کسی دیوار میں آجاتے ہیں

یہ ستم کم تو نہیں خواب فروشوں کے لیے
لے کے تعبیر کو دربار میں آجاتے ہیں

آسناتھ کنول

اے ہنر آشنا! ہنر خاموش!
کیوں ترے ضبط کا ہے در خاموش

جب بلائیں زمین پر اُتریں
کیوں رہا سب کا سب نگر خاموش

نطق و لب پر بھی نیند طاری ہے
اور تری آنکھ کا سحر خاموش

نوچتی پھر رہی ہے ذہنوں کو
چیختی کاٹتی نظر خاموش

چپ ہیں صحرا بھی اور دریا بھی
موج در موج ہے مگر خاموش

وہ ہمالہ کا ایک جنگل تھا
اور جنگل بھی اس قدر خاموش

کیسے چُپ چاپ دونوں کاٹ گئے
زندگی کا حسیں سفر خاموش

آس کا اک دیا جلا تو سہی
کیوں رہے درد کا یہ ڈر خاموش

غزل

پھر اُفق پر دل جڑا تھا شام سے
اور میں تنہا کھڑا تھا شام سے

آرزو مفلس کی یوں پھر سو گئی
خواب بھی اوندھا پڑا تھا شام سے

ڈوبتا سورج، جدائی آ پڑی!
وقت میرا پھر کڑا تھا شام سے

قافلہ شبیر کا گزرا ہے کیا؟
پھر کوئی خیمہ پڑا تھا شام سے

رات بھی مغموم ہوتی جائے ہے
کیا فسانہ پھر گھڑا تھا شام سے

میں ہوں داعی روشنی کا اس لیے
یاد ہے مجھ کو لڑا تھا شام سے

ہجرتوں کے سارے منظر کھو گئے
ایک منظر یوں پڑا تھا شام سے

طلعت شبیر

غزل

منظر نیا تو کوئی دکھایا نہیں گیا
اچھا ہوا کہ پھر سے رلایا نہیں گیا

یاروں سے ضبطِ حال کے تالے نہیں کھلے
ہم سے بھی ساز دل کا بجایا نہیں گیا

ترکِ تعلقات کی قینچی تو چل گئی
لیکن وہ شخص دل سے بھلایا نہیں گیا

شانے سے اس کا ہاتھ بھی میں نے ہٹا دیا
یہ بوجھ آج مجھ سے اٹھایا نہیں گیا

ڈستی رہی نظر کو چراغوں کی روشنی
دل کا دیا کسی سے جلایا نہیں گیا

شاہد وہ بادبانِ سماعت کھلے تو تھے
ہم سے ہی اپنا حال سنایا نہیں گیا

افتخار شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا، یا، نہ کُھلا میں

غزل

وہ چھپ بھی جائے تو مجھ کو دکھائی دیتا ہے
خموشیوں میں مجھے سب سنائی دیتا ہے

وہ اپنے ہونٹوں کی ہلکی سی ایک جنبش سے
گلِ خیال کو کیا کیا رسائی دیتا ہے

وہ اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے مے کدوں کے بیچ
کبھی کبھار عجب آشنائی دیتا ہے

طوافِ ذات عجب راس آگیا ہے اسے
گلی میں، شہر میں کم کم دکھائی دیتا ہے

کبھی کبھار تو بس یوں ہی آزمانے کو
وہ پاس رہ کے مجھے کم نمائی دیتا ہے

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لے نہ لکیروں میں گرفتار مجھے بھی
وہ ، نقش نہ کر دے سرِ دیوار مجھے بھی

غزل

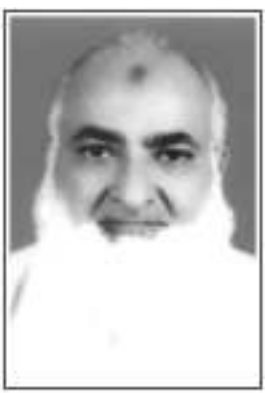

عقیل رحمانی

عمر ساری مجھے کانٹوں کی قبا لگتی ہے
زندگی لغزشِ آدم کی سزا لگتی ہے

مرتے دم تک نہیں بھولی تیرے آنچل کی مہک
ماں ترے دودھ کی تاثیر جُدا لگتی ہے

آم کے پیڑوں پہ بُور آئے تو پردیس میں بھی
ڈھونڈتی پھر مجھے کوئل کی صدا لگتی ہے

بچیاں نیکی کی چوراہے پہ کھل جاتی ہیں
جب بھی کردار کو شہرت کی وبا لگتی ہے

روشنی دیتا ہے پھر میرے بجھے دل کا چراغ
جب مجھے کوچۂ جاناں کی ہوا لگتی ہے

چھوڑ جاتے ہیں جو گھر ان کے مقفل در کو
دستکیں دینے سے پھر رنگِ حنا لگتی ہے

کھلتی ہے صحنِ چمن میں جو کوئی تازہ کلی
مجھ کو اس شوخ کی رنگین ادا لگتی ہے

جن کے سینے پہ کھدے نام مہکتے ہیں عقیل
ان درختوں کو محبت کی دعا لگتی ہے

غزل

ہر ایک ساعت ہجراں صدی صدی کی ہے
دیارِ عشق میں ہستی مگر کھری کی ہے

سمجھ رہا تھا جسے تیرگی کا ساتھی میں
اُسی نے میرے مقدر میں تیرگی کی ہے

یہ اور بات کہ اُس کے تلے اندھیرا رہا
چراغ نے تو بہرطور روشنی کی ہے

تمھاری مرضی ہے کچھ بھی کہو ہمیں لوگو
جو بات حق تھی سرِ بزم بس وہی کی ہے

ہمیں یقیں ہے ہمارا نصیب جنت ہے
کہ ہم نے کربلا والوں کی پیروی کی ہے

کرے گا وقت یقیناً یہ فیصلہ شاہد
کہ کس نے عشق کیا کس نے دل لگی کی ہے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

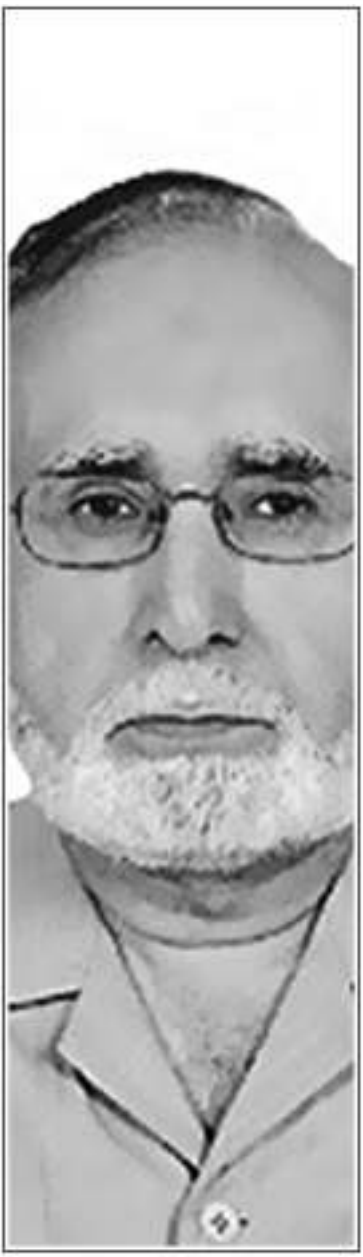

ہاتھ ایسا دکھا دیا مجھ کو
میرے قد سے گھٹا دیا مجھ کو

پہلے مجھ کو بٹھا لیا سر پر
پھر اچانک گرا دیا مجھ کو

ہائے! کتنا حسین سپنا تھا
ہائے! کس نے جگا دیا مجھ کو

روتی آنکھوں سے مُسکرا دینا
اِس ادا نے رُلا دیا مجھ کو

خاک سے ہی بنایا تھا تو نے
خاک میں ہی مِلا دیا مجھ کو

تیری دنیا کی دلکشی ، توبہ!
کام اپنا بُھلا دیا مجھ کو

اُس نبیؐ پر درود ہوں لاکھوں
جس نبیؐ نے خدا دیا مجھ کو

اِک تبسم نے کی مسیحائی
مر رہا تھا، جلا دیا مجھ کو

سید ضیا حسین

غزلیں

بڑوں کے بعد جہاں میں بڑا بنائے ہمیں
یہ کیسا وقت ہے اب وقت جو دکھائے ہمیں

نہ آئے لوٹ کے پھر وہ گلاب سے لمحے
جو دور بیت گیا ہے بہت رلائے ہمیں

وہ دل کا غم وہ شبِ ہجر کی پریشانی
ہوئی تمام ملے زلف کے جو سائے ہمیں

جو اُس سے گہرا تعلق تھا آج ٹوٹ گیا
اُسے یہ کہہ دو کہ بس اب وہ بھول جائے ہمیں

پھر ایک بار کھلے وہ دریچۂ ماضی
وہی نقوش محبت کبھی دکھائے ہمیں

کوئی نہیں ہے کہ جو آئے حال دل پوچھے
بدل گیا ہے جو منظر بہت ستائے ہمیں

چلا گیا ہے وہ مدت ہوئی مگر طاہر
ہنوز اُسکی مہک بحر و بر سے آئے ہمیں

طاہر ناصر علی

لب کی زینت ہیں اچھے اچھے جھوٹ
ہم نے بولے ہیں کتنے سچے جھوٹ
لوگ پھر بھی یقیں کریں جب کہ
آدھے کچے ہیں آدھے پکے جھوٹ
جیسے تھے لوٹے ویسے ہی ہم نے
جا کے بولے مدینے کے جھوٹ
تھا جو سچ اُس کو ہم نے چھوڑ دیا
سب سے لیکن بچا کے رکھے جھوٹ
کتنے مکار ہیں یہاں کے لوگ
سچ بھی بولا اگر تو سمجھے جھوٹ
رہتے ہیں مصلحت کے کوچے میں
اس لیے ہم نے صرف لکھے جھوٹ

یہ وہ محفل ہے جس میں روز و شب
سب نے ہی بولے سچ کے بدلے جھوٹ
ہم کو ایسا یہاں ملا نہ کوئی
جھوٹ کو جو ہمارے سمجھے جھوٹ
وقت نے عادی کر دیا اتنا
بولیں سچ اور لب سے نکلے جھوٹ
زندگی مسخ ہو گئی طاہر
عمر بھر ہم نے سب سے بولے جھوٹ

غزلیں

اُس کی تصویر جو رکھی تھی ہمارے دل میں
گھومتی پھرتی ابھی دیکھیے سارے دل میں

کسی مہتاب کے ٹوٹے جو کنارے مجھ میں
بن گئے سارے کے سارے وہ ستارے دل میں

جنہیں غفلت کبھی ہاتھوں سے اُڑا لے گئی تھی
اُڑتے پھرتے ہیں ابھی تک وہ غُبارے دل میں

جانے والوں نے تو جانا ہی تھا اک دن لیکن
کتنی پھیلا گئے ویرانی ہمارے دل میں

بغض نے دل ہی جلا ڈالا ہے دیکھو تو سہی
اور رکھو یہ کدورت کے شرارے دل میں

اُٹھ کے جاتی بھی نہیں شکل دکھاتی بھی نہیں
کون خواہش ہے پڑی پاؤں پسارے دل میں

اس سے پہلے یہاں اِک شہرِ شناسائی تھا
تُم ذرا دیر سے آئے ہو ہمارے دل میں

جس نے جانا ہے چلا جائے ابھی موقع ہے
شوق سے آئے جو آنا ہے ہمارے دل میں

جو بھی آتا ہے اسی جال میں پھنس جاتا ہے
دلبروں کو کوئی کرتا ہے اشارے دل میں

واجد امیر

میرے پیچھے پڑی رہتی ہے روانی میری
نہیں سُنتا یہ جمی جھیل کا پانی میری

ہائے! کس دل سے مکاں پرکھوں کا چھوڑا میں نے
تم نے دیکھی ہی کہاں نقلِ مکانی میری

اپنا کردار میں اِس ڈر سے تجھے سونپتا ہوں
مُجھ پہ ہی ختم نہ ہو جائے کہانی میری

پتھروں پر کہاں بارش کی نمی رہتی ہے
کیا اثر تُجھ پہ کرے عجز بیانی میری

آبشاریں سبھی دل میں ہی گرائیں میں نے
تا کوئی دیکھ نہ لے اشک فشانی میری

کنجِ غفلت سے نکلنے ہی کہاں دیتی ہے
گھر کی دیوار یہ ہمدرد پُرانی میری

صورتِ ماہ کوئی بامِ سخن پر چمکے
کاش بن جائے کوئی شعر نشانی میری

کچی عُمروں نے کیا ہجر شناسا واجد
ہو گئی ختم لڑکپن میں جوانی میری

غزل

بات سمجھنے سے قاصر تھے ہم پاگل دیوانے
بستی والے سچ کہتے تھے دور کے ڈھول سہانے

ایک حقیقت ہے یہ کوئی مانے یا نہ مانے
دل کو زخمی کر دیتے ہیں نور جہاں کے گانے

روز نکل جاتا ہوں گھر سے چھوڑ کے شور شرابہ
شہر میں رہ کر ڈھونڈ لیے ہیں میں نے کچھ ویرانے

کیسی تیری میری یاری کیسی رشتہ داری
میرے پاس نہ پھوٹی کوڑی تیرے پاس خزانے

ملا جی نے کھول لیا ہے گھر میں ہی میخانہ
خالص چیز نہیں دیتے تھے شاید وہ میخانے

صحراؤں سے یار شکایت ہے نہ شکوہ کوئی
میرے من میں آگ لگائی اک بہتے دریا نے

تیری اور ہے دنیا انصر تیری اور کہانی
تیرے اور ہیں شام سویرے تیرے اور زمانے

انصر حسن

غزل

کبھی لَو بڑھی تری یاد سے، کبھی خط پکڑ کے جلا دیا
کبھی شِدّتِ غمِ ہجر سے ترا نام لکھ کے مٹا دیا

مری خاک کو نہیں چاہ اب، رہی دوسرے کسی چاک کی
مرے کوزہ گر ترے ہاتھ نے جو بنا دیا سو بنا دیا

دلِ سوختہ کا وہ داغ ہو یا وہ منتوں کا چراغ ہو
ترے نام پر ترے بام پر جو جلا دیا سو جلا دیا

یہاں تشنگی رہے جب تلک نہیں پھیرتے ہیں نگاہ کو
یہاں ساقیوں میں رواج ہے جو بڑھا دیا سو بڑھا دیا

نہ وہ حدتوں بھرا ہاتھ ہے، نہ وہ شعلگی بھرا ساتھ ہے
ابھی مختصر یہی بات ہے جو بُجھا دیا سو بُجھا دیا

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس چھت سے کبھی دُھوپ اُترتی نہیں خالد
عزّت تو یہ دیتے ہیں گھرانے نہیں دیتے

غزل

شاخ پہ اس نے ہاتھ رکھا تھا
پیڑ کے اندر دل دھڑکا تھا

چیخ شجر کی سنتا کیسے
پتہ جیون پار گرا تھا

ایک کھنڈر میں یاد ہے تم کو
سانجھ سویرے بس میلہ تھا

خشک پڑی ہے دل کی ٹہنی
صدیوں پہلے پھول کھلا تھا

آدھی رات کا چاند تھا پورا
بے کل، تنہا، اک سایہ تھا

خالی گھر کی ٹوٹی چھت پر
جلتا بجھتا ایک دیا تھا

دروازے کی اوٹ سے کوئی
بابر چھپ کے دیکھ رہا تھا

احمد سجاد بابر

غزل

عارضی احتراز شعلے کا
دم میں کھلتا ہے راز شعلے کا

جس نے ڈالی تھی پہلی چنگاری
اس سے پوچھو جواز شعلے کا

سب محبت نے راکھ کر ڈالا
کیوں اٹھایا تھا ناز شعلے کا

کس گھڑی جانے یہ بھڑک اٹھے
خوف ہے نیم باز شعلے کا

چند سگریٹ پڑے ہیں ڈبی میں
ہے ابھی اک محاذ شعلے کا

چاند سورج نہ جگنوؤں کی قطار
کوئی رتبہ ہے شاذ شعلے کا

جس نے ٹھنڈا کیا تھا شعلے کو
تھا وہی کارساز شعلے کا

اے ہواء اک ذرا ہو آہستہ
کچھ مروت لحاظ شعلے کا

محمد حماد

غزلیں

جھوٹی شان و شوکت چھوڑ
لے ڈوبے گی شہرت ، چھوڑ

لافانی کے بارے سوچ
فانی دہر کی رغبت چھوڑ

پھولوں کی بھی چاہت کر
کانٹوں سے بھی نفرت چھوڑ

حد میں رہ کر جینا سیکھ
جذبوں کی یہ شدت چھوڑ

خرچ ہوئی تو کیا غم ہے
ہاتھ کا میل ہے دولت چھوڑ

اٹھ اب پرچم تھام کے رکھ
مشکل وقت ہے غفلت چھوڑ

ارشد بس اک بھول ہوئی
حکم ہوا کہ جنت چھوڑ

ارشد محمود ارشد

سرد موسم میں ہَوا تو نہیں مانگی جاتی
چھت ٹپکنے پہ گھٹا تو نہیں مانگی جاتی

تُو کسی اور کے کالر میں سجا پھول ہے دوست
تجھ کو پانے کی دعا تو نہیں مانگی جاتی

جس کی عریانی چھپائی ہو اندھیری شب نے
کیا کرے وہ کہ ضیا تو نہیں مانگی جاتی

اس محبت میں تجارت نہیں ہوتی مجھ سے
دل کے بدلے میں وفا تو نہیں مانگی جاتی

ان کو پُرکھوں کی روایت پہ ہے کاٹا جاتا
بے زبانوں سے رضا تو نہیں مانگی جاتی

جب سے منسوب ہوا ہے تُو کسی اور کے ساتھ
تیرے ہاتھوں کی حنا تو نہیں مانگی جاتی

ایک وہ شخص مقدر میں نہیں تھا ارشد
رب سے کچھ اور عطا تو نہیں مانگی جاتی

غزلیں

در کو دیوار کر لیا جائے
رستہ ہموار کر لیا جائے

پھر سے تعمیرِ نو کریں دل کی
پھر سے مسمار کر لیا جائے

کل جو کرنا تھا ایک وعدہ وفا
آج ہی یار کر لیا جائے

شام ہوتے ہی دیپ جلتے ہیں
دل کو دربار کر لیا جائے

ظلمت شب کے ختم ہونے تک
خود کو بیدار کر لیا جائے

اب تو انصر ہر اک تمنا سے
خود کو بیزار کر لیا جائے

انصر رشید انصر

مجھے معلوم تھا کم ذات بدل جائے گی
ہائے! دنیا بھی ترے ساتھ بدل جائے گی

کس نے سوچا تھا کہ اوقات بدل جائے گی
دے کے ہاتھوں میں مرے ہاتھ بدل جائے گی

وعدۂ وصل اسے یاد دلاتا، لیکن
مجھے معلوم تھا وہ بات بدل جائے گی

میں نہ کہتا تھا مجھے چھوڑ کے جانے والے
روزِ روشن میں سیہ رات بدل جائے گی

تجھ کو لگتا ہے ترے شعر بدل دیں گے اسے؟
پڑھ کے وہ ایسی خرافات بدل جائے گی؟

ہار کر سارا جہاں ایک اسے پا لوں تو
جیت میں شاذ! مری مات بدل جائے گی

شہزاد احمد شاذ

غزل

اے چشمِ زدن! تیرا سفر ہو کے رہے گا
دل آبلہ پا برق و شرر ہو کے رہے گا

محروم محبت سے ہے دل سوختہ ساماں
اب کس کی محبت کا اثر ہو کے رہے گا

پھر شوقِ تمنا لیے جاتا ہے اُسی سمت
دل پھر سے خجل چاک جگر ہو کے رہے گا

پھرتا ہوں لیے دہر میں سورج کی طرح دل
گزرے گی یہ شب نورِ سحر ہو کے رہے گا

گلشن میں جو اپنوں ہی سے بیگانہ ہوا ہو
وہ لالہ کبھی گردِ سفر ہو کے رہے گا

کہتا ہے غزل اپنے ہی انداز میں راسخ
یہ چرچا مرا ہر سو مگر ہو کے رہے گا

جواد احمد راسخ

غزل

تعلق توڑ کر سود و زیاں سے
ہم آگے چل رہے تھے کارواں سے

ہم ایسے موڑ پر آکر کھڑے ہیں
کئی رستے نکلتے تھے جہاں سے

زمیں پر کس قیامت کی گھڑی ہے
کوئی دیکھے تو جھک کر آسماں سے

جدائی کی کہاں سے اِبتدا ہو
تعلق کی رگیں کھینچیں کہاں سے

تعلق توڑنا مشکل نہیں ہے
بس اِک دیوار اُٹھے گی یہاں سے

فلک والو! ہمارا عجز دیکھو
کہ ہو کر آگئے ہیں لامکاں سے

بنایا پہلے مجھ کو خوب اونچا
پھر اُس نے توڑ ڈالا درمیاں سے

تمھارا لوٹ کر آنا مبارک
ہمیں لاؤ گے لیکن تم کہاں سے

ریاض رومانی

غزل

ہجر میں کھیلتا ہوں مَیں غم سے
دل بہلتا نہیں ہے کچھ کم سے

تیز جھونکا ہَوا کا اور پتے
جھوم اُٹھے ہیں سبز پرچم سے

خود کو رکھتا ہوں مَیں تر و تازہ
زخم بھرتا ہوں دکھ کے مَرہم سے

ایک مدت کے بعد سمجھا ہوں
ساری خوشیاں ہیں بس ترے دم سے

درد کو پالتا بھی ہے کوئی !
دوستو! بھول ہو گئی ہم سے

اپنے حصّے کی فصل کاٹی ہے
کوئی شکوہ نہیں دو عالم سے

چاند تاروں میں ہونے والی ظہورؔ
روشنی آئی چشمِ پُرنم سے

ظہور چوہان

غزل

دل میں جاگے ہوئے جذبوں سے بغاوت کرلیں
اس کی خواہش ہے بچھڑنے کی ارادت کرلیں

خشک جھیلوں سے پرندے بھی تو اُڑ جاتے ہیں
یوں نہ ہو ہم بھی ترے شہر سے ہجرت کرلیں

ہم غلط بات پہ خود سے بھی الجھ جاتے ہیں
کیسے ممکن ہے ترے ہاتھ پہ بیعت کرلیں

ہم اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں شب و روز کا بوجھ
ہم کو فرصت جو ملے ہم بھی محبت کرلیں

ہنس کے ملتے ہیں چلو شہر میں سب لوگوں سے
دل جو ٹوٹا ہے تو کچھ اس کی مرمت کرلیں

اشرف کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

اپنے خالق کی جستجو کی ہے
''جب دعا کی ہے، باوضو کی ہے''

سامنے اپنے آئنہ رکھ کر
دیر تک خود سے گفتگو کی ہے

دوستوں سے لڑا رہا ہے مجھے
کیا یہ سازش مرے عدو کی ہے

موت سے اک مکالمہ کرکے
زندگی کیوں لہو لہو کی ہے

میرے رب نے عطا کیا ہے مجھے
میں نے جس شے کی آرزو کی ہے

اُس نے غالب کی شاعری پڑھ کر
ہر گھڑی تم کہا ہے، تُو کی ہے

ظلمتوں کا طلسم ٹوٹ گیا
روشنی کس نے چار سُو کی ہے

پیڑ تو سوکھ بھی گیا ہے نوؔید
اب ضرورت اُسے نمو کی ہے

محمد نوید مرزا

غزل

نمائشوں کے نمونے مصوّرانہ ہیں
یہ کائناتیں خدا کا نگارخانہ ہیں

کوئی کنارہ نہیں حیرتوں کی وسعت کا
عجائبات کی دُنیائیں بیکرانہ ہیں

تمھارے خواب کے موتی تو یک گرہ ہوں گے
ہمارے خواب کی مالائیں دانہ دانہ ہیں

بہت سا وقت خدا کے بغیر کٹتا ہے
بہت سے شام وسحر ہیں جو بے زمانہ ہیں

گزرتا جاتا ہے شاہدؔ ہمارا مستقبل
ابد سے ماضی کی جانب کہیں روانہ ہیں

شاہد ماکلی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رکھتا ہے یہاں کون خبر عیب و ہنر کی
خالد ہمیں کس نے نظر انداز کیا ہے

غزل

وہ عشق مسافت ہے کہ بے چین بہت ہیں
سورج سی تمازت ہے کہ بے چین بہت ہیں

ہیں کون مرے صبر و تحمل کے طلبگار
یہ کس کی عنایت ہے کہ بے چین بہت ہیں

ہوتے ہی نہیں ختم محبت کے فسانے
اِس درجہ طوالت ہے کہ بے چین بہت ہیں

آنے کا ہے اِمکان تو ہم در پہ کھڑے ہیں
اور اُس پہ یہ حالت ہے کہ بے چین بہت ہیں

ارمان ہزاروں ہیں اُنہیں کیسے بتائیں
کہنے کی اِجازت ہے کہ بے چین بہت ہیں

شِکوہ تو کوئی اُن سے نہ شہزاؔد کیا تھا
یہ کیسی ندامت ہے کہ بے چین بہت ہیں

شہزاد احمد شیخ

غزل

ہو بات وقت کی تو کسی شے سے جی جُڑے
گزری ہے ایک عمر گھڑی سے گھڑی جُڑے

کچھ یوں ہوا تھا آخری سجدہ سخن طراز
پیشانی وہ ہے جس سے فقط بندگی جُڑے

اِک روز یوں بھی ہو تو بُرا کیا ہے اے خدا
صبحِ فغاں سے سیدھی شبِ خامشی جُڑے

پھر سوچتا ہوں خاص ضروری بھی تو نہیں
جادے کی آگہی سے مری گمرہی جُڑے

آئینہ اِک خلیج کی صورت ہے درمیاں
ہر دل کہے ہے مجھ سے یہی اجنبی جُڑے

اِک شعر کی طلب ہے سخن گستری سحرؔ
دیکھو کبھی کہی سے اگر اَن کہی جُڑے

حسنین سحرؔ

غزلیں

روح کو جسم سے انجان نہ ہونے دینا
دل کی بستی کبھی ویران نہ ہونے دینا

اپنی اولاد کو لاچار سمجھ کر اُن کی
خواہشوں کو کبھی قربان نہ ہونے دینا

خوب تحقیق سے کہنا غمِ ہستی پہ غزل
اپنے اشعار کو بے جان نہ ہونے دینا

وحدتِ عشق بھی ہے وحدتِ خالق کی مثال
عشق میں شرک کا امکان نہ ہونے دینا

ذات میں کشف و کرامات سمو لو لیکن
دیکھنے والوں کو حیران نہ ہونے دینا

عابدی دہر میں رہنا تو مسافر کی طرح
مستقل ربط کا امکان نہ ہونے دینا

علی حسین عابدی

آئنے خواب دیکھ لیتے ہیں
غم کے ابواب دیکھ لیتے ہیں

لوگ آنکھوں میں وسعتیں رکھ کر
صرف تالاب دیکھ لیتے ہیں

مدتیں ہو گئیں خوشی دیکھے
محفلِ ناب دیکھ لیتے ہیں

ہم کبھی اُس سے پھر نہیں ملتے
جس کے القاب دیکھ لیتے ہیں

خوں رُلاتی ہے زندگی کی کتاب
آخری باب دیکھ لیتے ہیں

عابدی لوگ بے وفا کیوں ہیں
اُن کے انساب دیکھ لیتے ہیں

غزل

دیارِ شوق میں آئے تھے ایک خواب کے ساتھ
گزر رہی ہے مسلسل کسی عذاب کے ساتھ

ہم اہلِ درد پکارے گئے صحیفوں میں
ہم اہلِ عشق اُتارے گئے کتاب کے ساتھ

پھر ایک شام پذیرائی چشم تر کی ہوئی
پھر ایک شام گزاری گئی جناب کے ساتھ

ہمیں یہ خوف اندھیرے نگل نہ جائیں کہیں
سو ہم نے جسم کو ڈھانپا ہے آفتاب کے ساتھ

ہوا نے سادھ لی چپ، رات نے دعا مانگی
ستارہ سہما رہا بجھتے آفتاب کے ساتھ

مکالمہ رہا جاری ہماری آنکھوں کا
بدن کی شاخ پہ کھلتے ہوئے گلاب کے ساتھ

کچھ اور چاہیے تشنہ لبی مٹانے کو
یہ پیاس وہ ہے جو بجھتی نہیں شراب کے ساتھ

زعیمؔ وہ مری دریا دلی سے ڈرتا ہے
وہ مجھ سے ملتا ہے لیکن بڑے حساب کے ساتھ

زعیم رشید

غزلیں

ہر ایک شخص کو میرا ہنر دکھائی دیا
تو میرے ساتھ نہیں تھا مگر دکھائی دیا

تب اپنے آپ سے اتنا میں شرمسار ہوا
جب اک بشر کے علاوہ بشر دکھائی دیا

خدا کو ماں ہی سمجھ کے جب اس سے لڑ پڑا میں
خدا کا تب جو مجھے درگزر دکھائی دیا

میں شہر والوں کی بینائی کیا کہوں کہ انھیں
جو میرا خیر کا پہلو تھا شر دکھائی دیا

عجب سفر ہے کہ اب ختم ہی نہیں ہوتا
جو ابتدا میں بہت مختصر دکھائی دیا

اسے بھلانے کی کوشش بری نہیں، لیکن
صغیر پھر بھی وہ دل میں اگر دکھائی دیا؟

صغیر احمد صغیر

اپنے آپ کو جانا نہیں
اس نے اب تک مانا نہیں

تو نے میرا حق کھایا
کیا تو میرا کانا نہیں

دل کی باتیں غور سے سن
یہ کوئی گانا وانا نہیں

تیرے کسی بھی اپنے نے
تیرا بوجھ اٹھانا نہیں

اس کے بارے مت پوچھو
جس رستے پر جانا نہیں

ملنے سے کیوں ڈرتے ہو
میں نے کوئی کھا جانا نہیں

مقصد شعر سنانا ہے
محفل کو گرمانا نہیں

تاج پہ نظریں رکھتا ہے
اس کے سر پر آنا نہیں

نام صغیر بتائیں کیوں
جب اس نے پہچانا نہیں

غزل

جنہیں جو لگتا ہوں سرکار سمجھ لیتے ہیں
کچھ عدو مجھ کو، کئی یار سمجھ لیتے ہیں

گو غلط ہی سہی اس واسطے دیتا ہوں جواب
خامشی کو یہاں اقرار سمجھ لیتے ہیں

شہر کا شہر مری بات سے خائف نکلا
میں سمجھتا تھا کہ دو چار سمجھ لیتے ہیں

اس طرح تو کبھی شیریں نہیں ملنے والی
آپ دیوار کو دیوار سمجھ لیتے ہیں

وقعتِ خُلق نہ کردار کی قیمت عزمی
لوگ زر کو یہاں معیار سمجھ لیتے ہیں

عزم الحسنین عزمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تخریب سے تعمیر کا آغاز کیا ہیغ
نفرت ہی سہی کچھ تو پسِ انداز کیا ہے

غزلیں

دِل سمندر تھا مگر غم بھی ہَوا جیسا تھا
جو بھی لمحہ تھا میسر وہ سزا جیسا تھا

اُس کے سانسوں کی حرارت سے خبر ملتی تھی
میرے ماحول میں وہ شخص صدا جیسا تھا

میں تہی دست اُسی شہر سے لوٹ آیا ہُوں
وہ کہ جس شہر کا ہر شخص خُدا جیسا تھا

ڈھانپ رکھا تھا سرِ شہر برہنہ اُس نے
جسم سے لپٹا ہوا کوئی قبا جیسا تھا

وقت نے چھین لیا اُس کو بھی آخر قائل
وہ جو کشکولِ تمنا میں عطا جیسا تھا

عمر قیاز قائل

آشنا میرے مری بات جو مانے ہوتے
ساتھ چلنے کے لیے آج زمانے ہوتے

تو مری راہ کی دیوار بنا ہے کب سے
ورنہ ہر لب پہ مرے آج فسانے ہوتے

کتنا انمول بِکا حُسن ترا گلیوں میں
میں ہی لے لیتا اگر پاس خزانے ہوتے

تُو شبِ غم کی اذیت سے جو گزرا ہوتا
دوست ایسے نہ ترے حیلے، بہانے ہوتے

اَب جو آسائشیں حاصل ہیں تو یہ سوچتا ہُوں
کاش ہمراہ مرے دوست پُرانے ہوتے

فیصلہ جس نے بہت سخت سنایا قائل
کاش اُس نے مرے حالات بھی جانے ہوتے

غزلیں

بند بنا کر روک دیا ہے باغی کو
سرکش ہوتی خواہش کی آزادی کو

محرم ہونے والا پیڑ سمجھتا ہے
بات کی تلخی کھاتی ہے شادابی کو

رفتہ رفتہ سب معمول پہ آئے گا
وقت لگے گا سہنے میں بربادی کو

اک نہ اک دن پچھتاوا کھا جائے گا
سب نے پیچھے چھوڑ دیا ہے ساتھی کو

دور کہیں شہروں میں نہریں کھودی ہیں
تب جا کر گھر لائے ہیں سیرابی کو

خوف نے سب آنکھیں بے حس کر ڈالی تھیں
جج نے آخر چھوڑ دیا اپھرادی کو

شام کو گھر پہنچا تو من آزاد ہوا
وہ دفتر میں ڈھونڈ رہا تھا چابی کو

صائمہ اسحاق

چپکے چپکے جھانک رہا تھا دروازہ
دیواروں کو ہانک رہا تھا دروازہ

مجھ کو رستہ دینے کی سرمستی میں
خود پر تارے ٹانک رہا تھا دروازہ

تم آئے تو دیپ جلے ہیں چوکھٹ پر
ورنہ مٹی پھانک رہا تھا دروازہ

ٹاٹ میں مخمل کا پیوند نہ لگ جائے
گھر کی قیمت ٹانک رہا تھا دروازہ

داغ لگے جب انگنائی کی چادر پر
گھر کی لنجا ڈھانک رہا تھا دروازہ

غزل

احساس بڑھ چلا ہے بہت اب تھکان کا
کب تک اُٹھائے بوجھ زمیں آسمان کا

کتنے لیے ہوئے ہے وہ بے رحمیوں کے زخم
چہرہ بتا رہا ہے یہ بوڑھے کسان کا

دنیا کی جلتی دھوپ میں ماں کی دعا ہے ساتھ
سایہ ہے سر پہ میرے اُسی سائبان کا

کیوں اجنبی کی طرح یہاں مل رہے ہیں لوگ
میں بھی تو ایک فرد ہوں اس خاندان کا

ہر چیز بک رہی ہے یہاں کوڑیوں کے دام
میں بھی ہوں اشتہار کسی کی دکان کا

بکھرے پڑے تھے جگنو، حسیں تتلیوں کے خواب
منظر عجب تھا شہر میں امن و امان کا

کتنے گھروں کو اُس نے بچایا تھا سنگ سے
ٹوٹا ہے آج آئنہ جس کے مکان کا

ریاض ندیم نیازی

غزلیں

خزاں کی شام کو زخمِ بہار کس نے کیا
ہر ایک ریشۂ گُل رنگ بار کس نے کیا

خوشی وصال کی ساری سمیٹ لی تو نے
فراق لمحوں کو بولو شمار کس نے کیا

ہر ایک شخص یہاں بدگمان تجھ سے تھا
نگاہِ یار! ترا اعتبار کس نے کیا

متاعِ جاں کو کیا خاک کس نے تیرے لیے
یہ خاکِ جاں ہی بتائے گی پیار کس نے کیا

وفا میں جان لٹانے کے بعد بھی لُبنیٰ
مرے خلوصِ محبت پہ وار کس نے کیا

لبنیٰ صفدر

کچھ سمجھ لوں، پرکھ تو لوں کہ نہیں
پھر بتاؤں گی تیری ہوں کہ نہیں

تو مری آنکھ میں تو جھانک ذرا
یہ سمندر ہے نیلگوں کہ نہیں

میں نے خود کو گلاب کرلیا ہے
تیرے گلدان میں سجوں کہ نہیں

اِک ستارہ سا تیری راتوں میں
صبحِ نو کی کرن بنوں کہ نہیں

جب بچھڑنے لگو بتا دینا
میں صدائیں بھی تم کو دُوں کہ نہیں

میں ترا نام اپنے نام کے ساتھ
مالکِ جان و دل! لکھوں کہ نہیں

ہجر تیرا جو مجھ کو لاحق ہے
اس کو تا عمر میں سہوں کہ نہیں

ایک پتھر کے ساتھ لُبنیٰ میں
شیشۂ دل لیے پھروں کہ نہیں

غزلیں

یہ تری یاد ہے یا تُو مرے دروازے پر
دستکیں دیتی ہے خوشبو مرے دروازے پر

دل بھی سنتا ہے تری چاپ نہاں خانوں میں
تیری آہٹ ہے کہ جادو مرے دروازے پر

دل تو تاریک ہی تھا دل میں اندھیرا کیوں ہے
پوچھنے آتے ہیں جگنو مرے دروازے پر

مری قسمت کہ ملی تجھ کو بھی اتنی فرصت
آ گیا چل کے جو خود تُو مرے دروازے پر

وسیم جبران

جال محبت کا ہو تو دانستہ جال میں رہ لوں گا
چال تمہاری جو بھی ہوگی، میں اُس چال میں رہ لوں گا

تیرا میرا رشتہ جیسے حزن اور سازِ محبت کا
میں بھی تو اک شعر ہوں تیرے سُر اور تال میں رہ لوں گا

خوب وکالت اُس کی کرتا ہے دل مجھ سے کہتا ہے
اُس کے گوشۂ لب کے میں چھوٹے سے خال میں رہ لوں گا

جانے اگلے سال رفاقت ہوگی کس کے ساتھ تری
تیرے ساتھ گذارا ہے جو میں اس سال میں رہ لوں گا

سچے موتی ہیں یہ پیروں میں بھی آ سکتے ہیں
نہ گرا آنکھ سے آنسو مرے دروازے پر

تُو نے چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کی ہے
تجھ کو لالچ ہے تری خُو مرے دروازے پر

مجھ کو منظور ہے دشمن کی بھی خاطر جبرانؔ
وہ جو آئے کھلے بازو مرے دروازے پر

لمحہ لمحہ خوشیوں کا ہو یا دکھ درد کا موسم ہو
مالک تُو جس حال میں رکھے میں اُس حال میں رہ لوں گا

پت جھڑ ہو یا فصلِ گُل جبرانؔ اُسی کی قدرت ہے
دکھ میں بھی میں شکر کروں گا، قحط اور کال میں رہ لوں گا

غزلیں

فقط اڑائے گا غبار، آپ جایئے
یہ عشق ہے جنوں شعار، آپ جایئے

ملال سازِ درد کا مجھے تو راس ہے
جو بج اٹھے ہیں دل کے تار، آپ جایئے

تمیزِ نیک و بد ہی بزم میں نہیں رہی
عجب اڑی ہے دھول یار، آپ جایئے

یہ کیا ضرور راحتیں ہی صرف دے سکوں
میں پا شکستہ، دل فگار، آپ جایئے

فرار دو گھڑی کا بھی محال عشق میں
اور ایک دل ہے غم ہزار، آپ جایئے

لڑایئے نہیں یہ داؤ پیچ عقل کے
مرے جنوں سے بار بار، آپ جایئے

بھلے دنوں کے دوستو، اداس مت رہو
چمن سے جا چکی بہار، آپ جایئے

اکرم جاذب

تمام رات وہ مجھ سے الگ ہوا نہیں ہے
یہ خواب ہے کہ حقیقت مجھے پتہ نہیں ہے

کسی کا لمس مسیحائی کر رہا ہے مری
سلگتا جسم بھی اب وقفِ ابتلا نہیں ہے

چھپا رہا ہے مجھے ڈھانپ ڈھانپ کر کس سے
ہمارے ساتھ اگر کوئی تیسرا نہیں ہے

میں چھو کے دیکھ رہا ہوں مہکتی سانسوں کو
یقین آنے لگا ہے کہ واہمہ نہیں ہے

ہمارے درمیاں اب کچھ نہیں رہا حائل
بدن ہے اور بدن کا اتہ پتہ نہیں ہے

تو کیا یہ پیار میں الہام ہو رہا ہے مجھے
تو کیا وہ واقعی شب بھر یہاں رہا نہیں ہے

میں کتنی دیر سے خود سے ہی لپٹا ہوں جاذب
یہ میرا عکس ہے اور مجھ پہ آئینہ نہیں ہے

غزلیں

اس گل بدن کو چوم کے شب بار بار میں
کرلوں گا اپنے آپ کو باغ و بہار میں

افسوس ہے کہ کوئی مدد کر نہیں سکا
سنتا ہی رہ گیا ہوں کسی کی پکار میں

چہرہ شناس ہونے کا دعویٰ اسے بھی ہے
جس کو دکھائی دیتا نہیں سوگوار میں

ہر ایک کو تلاش ہے راہِ فرار کی
چھوڑوں نہ تیرے درد کا لیکن مدار میں

اتنا پتا تو چل گیا دوزخ سے کم نہیں
رہتا ہوں جس جہان میں پروردگار میں

آتے ہیں سب غریب کی کٹیا میں شوق سے
تیری طرح سے رکھتا نہیں پہرا دار میں

کب تک رکھوں جہان میں جینے کی آرزو
حالات دیکھ دیکھ کے ناسازگار میں

امکان تیرے لوٹ کے آنے کا جب نہیں
کیوں دیکھتا ہوں گردشِ لیل و نہار میں

ازور شیرازی

ہم پھر بھی چاہتے ہیں کہ تیری زباں کھلے
گرچہ پڑے ہیں شہد کے سب مرتباں کھلے

اے دوست! یہ عوام نہیں ہیں ہجوم ہیں
کچھ سوچ کر دیا کرو اتنے بیاں کھلے

تجھ کو بتا رہا ہوں شراکت سے پیشتر
ہوتے ہیں کاروبار میں سود و زیاں کھلے

اب بھی زمیں پہ چلتا ہوں آہستگی کے ساتھ
گرچہ زمانہ بیت گیا ہیڑیاں کھلے

دو مرلے کے فلیٹ میں کل خاندان ہے
میں کیسے مان لوں ترے کون و مکاں کھلے

تاعمر تو گھرا رہے یاروں کے درمیاں
تجھ پر مری طرح نہ صفِ دوستاں کھلے

کیوں ہے وصالِ یار پہ لوگوں کو اعتراض
پھولوں سے مل رہی ہیں اگر تتلیاں کھلے

غزلیں

ترے ہونٹوں پہ جب میرے لیے حرفِ دعا ہوگا
مرے دل میں تری خاطر وفاؤں کا صلہ ہوگا

یہاں تو خامشی کے میں نے پردے پھاڑ ڈالے ہیں
یہاں پتھر اگر ہو گا یقیناً بولتا ہو گا

دیا جلتا تھا بچپن سے تری یادوں کا جوول میں
ہواؤں سے الجھ کر وہ دیا آخر بجھا ہوگا

یہ راہیں عشق کی مجھ کو فقط اتنا بتاتی ہیں
مسافر اپنی منزل سے ہی آگے جا چکا ہوگا

علاجِ بے خودی سمجھا ہے میرا دل یہی آخر
جو سمجھاتا ہے پاگل کو وہ دیوانہ رہا ہوگا

اسے پروا نہیں ہے جو زمانے میں کسی کی بھی
مجھے لگتا ہے تنہائی میں خود سے وہ ملا ہوگا

بہت ہی کم ملے گی تم کو دنیا میں اگر دیکھو
برائی سے جہاں بھی ابتدا میں واسطہ ہوگا

شجر کاٹا ہے کس نے تیری بستی میں شہاب اللہ
یہاں جو ایک پنچھی تھا یقیناً مر گیا ہوگا

شہاب اللہ شہاب

میری باتیں سن کے پر سب پنچھیوں کے جھڑ گئے
غم کی ارزانی سے پتے ٹہنیوں کے سڑ گئے

اس کی منزل اتنی مشکل تھی بتاؤں کیا تجھے
یاد آئی جب کبھی، پاؤں پہ چھالے پڑ گئے

میں ذرا سا ہی رکا تھا اک شجر کے سائے میں
درد کو محسوس کر کے برگ سارے جھڑ گئے

علم جن کے پاس تھا سو وہ سراپا عجز تھے
دور تھے منطق سے جو وہ اپنی ضد پر اڑ گئے

زہر میں کچھ اس قدر ڈوبے ہوئے الفاظ تھے
آئنہ دیکھا تو میرے ہونٹ نیلے پڑ گئے

اپنی ہی تہذیب کو ہم دفن ہوتا دیکھ کر
شرم کے مارے جہاں تھے ہم وہیں پر گڑ گئے

وہ گلے لگ کر ملا تو میں نے یہ دیکھا شہاب!
خالی آنکھوں میں محبت کے نگینے جڑ گئے

غزلیں

جب کوئی دریچہ نہ پرندہ نہ شجر ہے
پھر سوچیے کس طور یہاں زندہ بشر ہے

معلوم یہی ہوتا ہے سنسان کھنڈر ہے
گویا کوئی تاریخ کا آباد نگر ہے

اُس سمت کشش کون سی لے جاتی ہے دل کو
یادوں کے جزیرے میں جو ویران سا گھر ہے

ہاتھوں میں صداقت کا علم لے کے چلا ہوں
ہر گام مری منزلِ مقصد پہ نظر ہے

جو صورتِ خورشید تھا دنیائے ادب میں
اخبار میں اُس شخص کے مرنے کی خبر ہے

یہ نام یہ عزت جو خدا کی ہے ودیعت
ماں باپ کی بے لوث دعاؤں کا اثر ہے

نوید سروش

منظر رہا کبھی پسِ منظر نہیں رہا
ویسے بھی دوستوں سے میں چھپ کر نہیں رہا

مجھ سے خفا ہوئے ترے دریا تو یہ ہُوا
پہلے کی طرح جوشِ سمندر نہیں رہا

غیروں کا کیا ہے اپنے بھی اپنے نہیں رہے
جب اوج پر ہمارا مقدر نہیں رہا

سرگرداں آج ہے کوئی میرے لیے سروش
جب کہ میں آج خود کو میسر نہیں رہا

غزل

فراق و وصل ہی کے تذکروں میں زندگی گزری
ترے حسنِ نظر کے دائروں میں زندگی گزری

نہ جانے کیا کہا اظہارِ الفت پر ستم گر نے
برستے آنسوؤں کے ساونوں میں زندگی گزری

مرے مجموعۂ افکار میں عکسِ طرب کیسا؟
مری تو لحہ لحہ سانحوں میں زندگی گزری

گلہ شکوہ کروں کیا بحرِ غم کی بیکرانی کا
تری موجِ تبسم کی حدوں میں زندگی گزری

نظر آئے نہیں چشمِ انا کو روز و شب اپنے
ہمیشہ دوسروں پر تبصروں میں زندگی گزری

بھلا اچھے بُرے کا فیصلہ ہم کر سکیں کیسے؟
بزرگوں کے بتائے راستوں میں زندگی گزری

نکل کر جسم کی حد سے کبھی دیکھوں اُڑان اپنی
انھی بے نام خودسر حسرتوں میں زندگی گزری

نمو پاتی بھلا کیسے مری شاخِ طلب فرحان
کسی بے رحم پت جھڑ کے سموں میں زندگی گزری

سرور فرحان

غزل

زندہ رہنے کی آس رہنے دو
تم ہمیں بس اداس رہنے دو

اِک جہاں منتظر ہمارا ہے
جن کو دُنیا ہے راس رہنے دو

ہم بہت خوش ہیں عام ہونے میں
خاص لوگوں کو خاص رہنے دو

ہم سے پہلے بھی لوگ پیاسے تھے
کیوں بجھاتے ہو پیاس رہنے دو

گو کہ سارے حواس رکھتے ہیں
تم ہمیں بے حواس رہنے دو

آخری چاند اور سفیدی ہے
آخری ہے لباس ، رہنے دو

ساری شامیں ہی ساتھ گزری ہیں
آخری شام پاس رہنے دو

آصف خیالؔ

غزل

اتنی کشش ہے کیونکر مولا پانی میں
آخر کس کا عکس ہے ابھرا پانی میں

آیا تھا آندھی کے جھونکے کی صورت
جس نے اپنا گھر ہے بنایا پانی میں

آجا ہم بھی قطرہ قطرہ فرحت لیں
سارا عالم جب ہے ڈوبا پانی میں

اترا ہے روشن چندا اس میں یا پھر
اس نے اپنا کنگن پھینکا پانی میں

آخر اس میں کون نہانے آیا تھا
کس نے اتنا نشہ گھولا پانی میں

اب کے برس سیلاب کچھ ایسا آیا ہے
ڈوب گیا ہے سارا اثاثہ پانی میں

ذکی طارق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

غزل

اِس دور میں بھی عشق کرے گا مرے گا کیا
تُو نوکری اگر نہ کرے گا کرے گا کیا

انجام دوسروں کا یہاں دیکھتا ہوں جب
میں سوچتا ہوں عشق میں میرا بنے گا کیا

تھوڑا بہت دماغ سے لینا پڑے گا کام
دل ہی تمام فیصلے کرتا رہے گا کیا

اُس کے بغیر بھی تو کوئی زندگی نہیں
اُس کے بغیر عمر بھر اب تُو جیے گا کیا

گر شاعری سے بادہ و مینا نکال دیں
اس میں نصیحتوں کے علاوہ بچے گا کیا

جس گلشنِ سخن کے ہوں گلچیں ہی بے ہنر
اُس میں کمالِ فن کا کوئی گُل کھِلے گا کیا

چھائے ہوئے ہیں چرخِ ادب پر فقط گروہ
تنہا جو لڑ رہا ہے فلک پر چڑھے گا کیا

جینے کا آسرا ہے نہ پینے کا سلسلہ
سگریٹ نہیں پیے گا تو کوئی پیے گا کیا

اِس عمر میں بھی پیار کی کرتا ہے یارؔ بات
اِس عمر میں بھی حسرتِ دل سے جلے گا کیا

سہیل یار

غزل

اُس کے چہرے کو ہنر آتا ہے
بند آنکھوں میں بھی در آتا ہے

اُس کی تعظیم میں دستار کے ساتھ
سر بھی شانے سے اُتر آتا ہے

کتنا بے سمت چلا ہوں میں بھی
دشت آتا ہے نہ گھر آتا ہے

سیدھا رستہ ہے محبت گرچہ
اِس میں اِک موڑ مگر آتا ہے

وہ اُدھر سوچتا ہے اور اِدھر
پھل درختوں سے اتر آتا ہے

وقت کی جادوگری ہے یہ بھی
دیکھتا ہے نہ نظر آتا ہے

میں وہ بادل ہوں ترے صحرا کا
جس کے سائے میں شجر آتا ہے

عشق وہ نخلِ یقیں ہے راجاؔ
سُوکھتا ہے تو ثمر آتا ہے

اویس راجا (نیویارک)

غزلیں

ہم نے جب اُن سے پہلی ملاقات کی
آخری بات تھی وہ جو اک بات کی

چاند سورج ستارے سبھی پا لئے
چھٹ نہ پائی مگر تیرگی رات کی

خونِ دل سے لِکھی داستانِ سفر
ہم نے کاغذ پہ اشکوں سے برسات کی

حُسن کے ناز کو جس نے گھائل کیا
کرچیاں تھیں وہ میرے خیالات کی

زندہ لوگوں سے اُن کے مکاں چھین کر
ہو رہی ہے سجاوٹ مزارات کی

جشن مل کر منائیں نہ کیوں موت کا
سوگواری تو بدلے گی حالات کی

تم نے الطاف دل کھول کر رکھ دیا
بات ایسی کہی بس کہ کیا بات کی

محبت کا وہ سلسلہ کیا ہُوا
ترا مجھ سے عہدِ وفا کیا ہُوا

کہاں کھو گیا تیرا شوقِ جنوں
ترا ذوقِ آتش نُما کیا ہوا

خزاں تھی مخالف چمن زار کی
مگر تُجھ کو بادِ صبا کیا ہُوا

بڑا ناز تھا تجھ کو احباب پر
سِتم تُجھ پہ کس نے کیا ، کیا ہُوا

دمِ قیس سے تو بیاباں بَسے
مگر بعد میں شہر کا کیا ہُوا

سید الطاف بخاری

غزلیں

فقط ریگِ رواں تھی اور تنہا اک خدی خواں تھا کہ میں تھی
تھا صحرا، آگ برساتا ہوا سورج پسِ جاں تھا کہ میں تھی

رواں تھی نیلگوں اِک گنگناتی جھیل سمتِ عشق لیکن
کہیں رستے میں سدِ راہ خود میرا گماں تھا کہ میں تھی

نہیں اترا تھا اب تک آبشاروں کی تہوں میں عکس میرا
مگر لہروں کے آئینے میں کل اک چاند جواں تھا کہ میں تھی

کہاں وہ بارگاہِ اہلِ غم کا سنگِ اسود اور کہاں میں
کہ باب خانقاہِ شوق پر اک سایہ رقصاں تھا کہ میں تھی

یہ قندیلیں سرِ طاقِ فلک جو جھلملاتی تھیں پسِ شب
سرِ مژگاں یہ ترسیلِ لہو سے نم چراغاں تھا کہ میں تھی

اماوس رُت نہ اُس کا غم اداسی اور نہ اُس کی منتظر آنکھ
کہ زیر و بم سے سانسوں کے تھی کنجِ شبستاں تھا کہ میں تھی

نہاں تھیں آسمانِ معرفت کی تہہ بہ تہہ پرتیں جو انجم
وہ بزمِ کشتگانِ عشق پر اترا دبستاں تھا کہ میں تھی

خاکداں زد پہ ہے تغیر کی، خانہ انداز آسماں تاراج
موسموں کا مزاج برہم ہے، جا بجا فرشِ گلستاں تاراج

بحر خاموش ہے بھنور چپ ہیں، کوئی طوفان بیقرار نہیں
لہر کس سمت سے اٹھی کہ ہوئیں دوشِ ساحل پہ کشتیاں تاراج

عکس روپوش ہیں ابھی کچھ دیر، حیرتیں آئنوں سے باہر ہیں
اک جہاں عرصۂ شہود میں ہے، اور ہوتا ہے اک جہاں تاراج!

ساعتیں ہوگئی ہیں زیر و زبر، اک نیا ضابطہ نفاذ کو ہے
لحظہ لحظہ بکھر گئی تقویم، لمحہ لمحہ ہوا زماں تاراج

اسم پڑھیے کوئی اماں کے لیے، کھینچیے اک حصار چہار اطراف
اک بلا ناگہاں مسلط ہے، کر رہی ہے جو بستیاں تاراج

جب بھی انجم اسے تلاش کیا، وہ تو شہ رگ سے بھی قریب ملا
تب یقیں جاگزیں ہوا دل میں، خود بخود ہو گیا گماں تاراج

انجم عثمان

غزلیں

نفسا نفسی کی اس روانی میں
بہہ گیا ہے خلوص پانی میں

دکھ مکمل وجود رکھتے ہیں
نامکمل سی زندگانی میں

میں مُقلد ہوں قیس کا یعنی
عمر گزری ہے رایگانی میں

قصہ گو کب کا مر چکا لیکن
ریل چلتی رہی کہانی میں

ہم قلندر مزاج لوگوں کو
لطف آتا ہے بے مکانی میں

راج کرتی ہے اک سخن زادی
میری غزلوں کی راجدھانی میں

امتحاں لاکھ ہیں مگر ساحلؔ
عشق لازم ہے زندگانی میں

ارسلان ساحل

رتجگوں کا سماں رات ساری رہا، رقص جاری رہا
خواہشوں کا فسوں دل پہ طاری رہا، رقص جاری رہا

لوگ تصویر کے دوسرے رخ کو ہی سچ سمجھتے رہے
پر حقیقت سے ہر شخص عاری رہا، رقص جاری رہا

موت برحق سہی سب نے مرنا ہے اک دن مگر دوستو
زندگی کا جنوں سب پہ بھاری رہا، رقص جاری رہا

میں جہاں بھر کے ظلم و ستم سہہ گیا تیری خاطر مگر
تیرا بخشا ہوا زخم کاری رہا، رقص جاری رہا

اک طرف بے خطا لوگ مارے گئے کس پہ وارے گئے؟
اک طرف ظلم کا کھیل جاری رہا، رقص جاری رہا

وقتِ رخصت مگر ساتھ لیتا گیا سب کی سب رونقیں
جب تلک شہر میں وہ مداری رہا، رقص جاری رہا

میں تجھے پڑھی لاکھوں سجدے کیے پر یہ گستاخ دل
عشق مذہب کا ساحلؔ پجاری رہا، رقص جاری رہا

غزل

پھر بہانا کوئی بنایا گیا
شاخ سے آشیاں گرایا گیا

اپنے آنگن میں روشنی کے لیے
زرد پتوں کو آزمایا گیا

قربتِ آفتاب بڑھتی گئی
جل اُٹھے پاؤں، سر سے سایا گیا

در بدر کر دیا پرندوں کو
کاٹ کر پیڑ گھر بنایا گیا

خاک نے خاک تک پہنچنا تھا
عمر بھر راستہ دکھایا گیا

زندگی کب گزرنے والی تھی
نقش دیوار پر بنایا گیا

روشنی پھوٹنے لگی عاصمؔ
شدتِ غم میں گنگنایا گیا

عاصم اعجاز

غزلیں

میں اگرچہ گھماؤ میں ہوں
لگ رہا ہے بہاؤ میں ہوں

میں ہوں زیرِ اثر کسی کے
میں کسی کے دباؤ میں ہوں

تند خوئی بھی برہمی بھی
مستقل اک تناؤ میں ہوں

وقت چال الٹی چل گیا ہے
پھنس گیا اپنے داؤ میں ہوں

اوروں کے انتخاب کا کیا
جب میں تیرے چناؤ میں ہوں

میرے دلگیر ! دیکھ میں بھی
مبتلا ایک گھاؤ میں ہوں

تند لہروں کا غم نہیں ہے
ایک محفوظ ناؤ میں ہوں

احمد محسود

میری کھوئی ہوئی جاگیر، میں صدقے جاؤں
اے مرے خواب کی تعبیر، میں صدقے جاؤں

وہ گل اندام وہ معصوم سی صورت اس کی
ہائے وہ پیاری سی تصویر، میں صدقے جاؤں

تم ہی ہو جس نے بگڑنے سے بچا رکھا ہے
اے مرے پاؤں کی زنجیر، میں صدقے جاؤں

تم کو اک لمحہ خفا دیکھ نہیں سکتا میں
میرے پیارے مرے دلگیر، میں صدقے جاؤں

غزلیں

ہر خوشی جس پہ اپنی وار آئے
دکھ بٹانے کہاں وہ یار آئے

مسکرا کر عبور دشت کیا
چاہے رستے میں جتنے خار آئے

کیسا آسیب ہے مرے گھر پر
غم کے موسم ہی بار بار آئے

عشق کے راستے میں اے فرخ
زندگی کب سے اپنی ہار آئے

سید فرخ رضا ترمذی

سنگِ تہمت کا ہدف میرا گریبان بنے!
پھر ترے گاؤں کی مٹی سے نمکدان بنے!

اب تو خوابوں کے تعطل کا زمانہ آیا
اب تو مشکل سے ملاقات کا امکان بنے

ہر نیا شخص نیا زخم لگاتا جائے
اس قدر پھول تو مل جائیں کہ گلدان بنے

اپنے اجداد کی پہچان نہیں تھی جن کو
آج وہ لوگ مرے شہر کی پہچان بنے

پہلے اک اسمِ مُبیں لوحِ سخن پر اُترا
بعد میں بحریں بنیں، بعد میں اوزان بنے

میری تصویر بناتے ہو مگر یاد رہے
آنکھ حیران بنے، زلف پریشان بنے

فائق ترابی

عقلِ کل [مکالماتی مائیکرو فکشن]

"میں 'عقل کل' ہوں"
"نہیں میں 'عقل کل' ہوں"
"بالکل نہیں، 'عقلِ کل' صرف میں ہوں"
"نہیں نہیں، 'عقل کل' صرف اور صرف میں ہوں"
"اچھا، چلو ایک کام کرتے ہیں"۔
"کیا کام؟"
"ہم ایسا کرتے ہیں ان دونوں کو بانٹ لیتے ہیں"
"میں سمجھا نہیں"
"مطلب یہ کہ میں عقل رکھ لیتا ہوں تم 'کُل' رکھ لو"
"اچھا-----"
"ہاں، ایسے معاملہ سلجھ جائے گا"۔
"ہر گز نہیں"
"کیوں اب کیا ہوا؟"
"تم بہت سیانے ہو۔ عقل اپنے پاس رکھ رہے ہو۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا"۔
"تو تم کیا چاہتے ہو؟"
"عقل میں رکھوں گا، تم کُل رکھو۔ سمجھ آئی؟"
"بہت بیوقوف انسان ہو تم"
"بیوقوف کیسے؟"
"بھئ دیکھو، عقل تو تمہارے پاس پہلے سے ہی ہے تو پھر عقل کیوں رکھنی ہے تم نے؟"
"اچھا؟"
"تو اور کیا، دیکھو عقل تمہارے پاس پہلے سے ہی ہے اور 'کل' میں نے دے دیا تو یوں کل ملا کر تم 'عقل کل' بن گئے ہو"۔
"واقعی؟ میں عقل کل بن گیا ہوں؟"
"تو بدھو! میں یہی تو تمہیں سمجھا رہا ہوں کب سے"
"لیکن 'عقل کل' میں سے جو 'عقل' ہے وہ تم کیوں اپنے پاس رکھ رہے ہو؟ وہ تمہارے کس کام کی؟
"بھئ، میں کم عقل ہوں نا تو مجھے عقل کی ضرورت ہے تو اسی لیے میں یہ عقل رکھوں گا"۔
"نہیں، مجھے یہی والی عقل چاہیے"۔
"دیکھو ایسے نہیں ہو سکتا"
"اب تو میں بضد ہوں"
"لیکن کیوں؟ تم تو 'عقل کل' ہو نا؟"
"لیکن فیس بک پر تم یہ اعلان کرو گے کہ عقل تمہارے پاس ہے اور یوں تمہارے پیروکاروں میں اضافہ ہوگا میرے نہیں"
"تو تم ابھی پوسٹ کرو جا کر اور بتاؤ کہ تم 'عقل کل' ہو"
"اچھا میں ابھی کرتا ہوں"
"دوستو! میں عقل کُل ہوں"
وہی دوسرے آدمی نے اس پوسٹ کے نیچے کمنٹ کیا
"نہیں میں عقل کل ہوں، اس کے پاس تو عقل ہی نہیں ہے"

عمار نعیمی

ایک دلکش شعری مجموعہ

اسلام عظمی نے شاعری اور نثر کی کئی اصناف کو اپنے خیالات، مشاہدات اور محسوسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اِن کے تین افسانوی مجموعے، دو ناول اور ایک مجموعۂ مضامین اِن کی نثری صلاحیتوں کا وافر ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ شاعری کے تین مجموعے اِس بات کی طرف سمت نمائی کرتے ہیں کہ وہ اظہارِ ذات کے لیے نظم و نثر کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ اُردو کے ساتھ وہ پنجابی میں شعر گوئی کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں اور کئی دہائیوں سے اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اگرچہ اُنھوں نے نظم و نثر میں رنگا رنگ تجربات صفحۂ قرطاس پر منتقل کیے ہیں لیکن اُن کی شاعری اپنی خصوصیات کی بنا پر دیگر اصناف پر فوقیت رکھتی ہے۔ تین شعری مجموعوں کے بعد اُن کا چوتھا شعری مجموعہ ''ناتراش'' عنقریب اشاعت پذیر ہونے والا ہے۔ اِس تاثراتی تحریر میں اُن کے نثری کام کے بارے میں فی الحال کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تاہم ''ناتراش'' کے حوالے سے چند باتیں عرض کیے دیتا ہوں۔

اِس مجموعے کی شاعری معمولات کی شاعری نہیں ہے۔ ہمارے ارد گرد اتنی شاعری ہو رہی ہے کہ اس کے جملہ رجحانات سے آگاہ ہونا ناممکن نہیں تو اَز حد

خواجہ محمد زکریا

مشکل ہے۔ تاہم جس شاعری سے مجھے آگاہی ہے اِس کے پیشِ نظر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے اکثر ہم عصر شعرا سے الگ نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اُنھوں نے بہت محسوس کر کے شعر کہے ہیں۔ اِس لیے اگر اُن کی شاعری معاصرین سے مشابہت رکھتی بھی ہے تو شدتِ احساس اُنھیں دیگر شعرا سے الگ کر دیتی ہے۔

ہم جس سرزمین کے باسی ہیں وہاں واقعات دائرے میں گھومتے ہیں۔ ہم جن واقعات سے گزر جاتے ہیں پھر وہیں واپس آ جاتے ہیں۔ آگے بڑھنے کی کوئی سنجیدہ خواہش نظر نہیں آتی گویا ہم ایک شیطانی چکر میں گھرے ہوئے ہیں۔ اربابِ اختیار کو چونکہ کوئی مسائل درپیش نہیں ہیں اِس لیے عام لوگ جن مسائل میں مبتلا ہیں، وہ اِن سے باخبر ہونے کے باوجود بے حس ہیں۔ اسلام عظمی جیسے حساس لوگ دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں کہ لیکن وہ حالات کی بہتری کے لیے کچھ کر نہیں سکتے، چنانچہ وہ شاعری کے ذریعے کیتھارسس کرنے پر مجبور ہیں۔ معاشرے کے دُکھوں کو شدت سے محسوس کرنے کی وجہ سے وہ ایسے شعر کہنے میں کامیاب رہتے ہیں جو پڑھنے والوں کو بھی اُن دکھوں کا احساس دلا سکیں۔

اُنھوں نے اس شعری مجموعے کو "ناتراش" کا عنوان دیا ہے جو بظاہر انکسار کا اظہار ہے لیکن اس میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ زیادہ تراش خراش سے شاعری مصنوعی نظر آنے لگتی ہے۔ اِس لیے اگر اسلوب میں کہیں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ شدتِ احساس کو آرائش سے مُبرا رکھا گیا ہے۔

اِس مجموعے میں جگہ جگہ جذت اور انفرادیت کے نقوش جلوہ گر ہیں۔ ذخیرۂ الفاظ بھی متعدد جگہ پر غیر روایتی ہے اور نئے پن کا احساس دلاتا ہے۔ شعری زمینوں میں بالعموم دوسروں کی پیروی کرنے کے بجائے اپنا راستہ خود نکالنے کی کاوش نظر آتی ہے۔

"ناتراش" میں اسلام عظمی کی صلاحیتوں کا خوب اظہار ہوتا ہے۔ موضوعات کے تنوع، اسلوب کی جدت اور احساس کی گہرائی نے اس مجموعے کو کامیاب شاعری کا دلکش نمونہ بنا دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

مکلی میں مرگ

کسی زندہ ادیب اور بالخصوص کسی عزیز دوست کی کتاب پر تنقیدی انداز میں کچھ لکھنا بیک وقت مشکل بھی ہے اور آسان بھی، لیکن لکھنے والا اگر غافر شہزاد جیسا معروف قلمکار اور کتاب اس کے زیر نظر ناول ''مکلی میں مرگ'' جیسی غیر روایتی ہو تو صورتِ حال کچھ کچھ غالبؔ کے اس مصرع کی سی ہو جاتی ہے کہ : سخت دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا 207- صفحات پر مشتمل یہ تحریر جسے مصنف نے ناول کا نام دیا ہے، میں نے حرف حرف پڑھی ہے۔ اس عمل کے دوران اس خوبصورت تحریر پر کئی اصناف نثر کے گمان گزرے مگر ناول کی جو تعریف اور تصور عمومی طور پر رائج اور تسلیم شدہ ہے، اس کی طرف ایک بار بھی دھیان نہیں گیا مگر پھر بھی خیال آتا ہے کہ لفظ Novel کا مطلب ہی نئی اور انوکھی تحریر ہے کہ یہ اپنے آغاز سے قبل کی داستان گوئی اور قصہ نگاری سے یکسر ایک مختلف انداز کی تحریر تھی جس میں پرانی کہانیوں کی طرح کردار اور واقعات تو ہوتے تھے مگر ان کو بیان کرنے میں مصنف پلاٹ، مکالموں، ذہنی کیفیات اور اردگرد کے ماحول سے بھی کام لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم روسی اور اس کے بعد لاطینی امریکہ کے ناولوں کو یورپ میں لکھے جانے والے ناولوں سے بہت مختلف دیکھتے ہیں۔

غافر شہزاد کے اس ناول میں روسی ناولوں کے کرداروں کی سی افراط اور اس کے عنوان میں لاطینی امریکہ کے ناول نگاروں بالخصوص گبریل گارسیا مارکیز کے ''لوان دی ٹائم آف کولرا'' کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ناول کا آغاز امریکہ میں پیدا ہونے والے پاکستانی نژاد نوجوان آرکیٹیکٹ ارسلان منصور کی صوبہ سندھ کے مشہور مکلی کے قبرستان میں ہونے والی ایک عالمی کانفرنس کے دعوت نامے سے ہوتا ہے اور اختتام بھی اگرچہ لاہور کے ایک معروف بی بی پاک کے مزار کے اس نئے ڈیزائن پر ہوتا ہے جس کے پیچھے تاریخ، فرقہ واریت، مذہبی اعتقادات اور صائمہ علی کا جنون آمیز مشن ساتھ ساتھ چل رہے ہیں جب کہ درمیانی صفحات میں بہت سے کردار مختلف حوالوں سے ارسلان کی زندگی اور اس

امجد اسلام امجد

کے پاکستان کے قیام کے عرصے میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

ناول میں جگہ جگہ نئے اور پرانے مزاروں کے حوالے، جدید اور قدیم فن تعمیر اور مجاز اور حقیقت کے مباحث اور باہمی تعلق پر بات کی گئی ہے اور بیشتر مقامات پر قاری غافر کے پیش کردہ بیانیے میں گم اور محصور رہتا ہے کہ وہ خود نہ صرف ایک باکمال آرکیٹیکٹ ہے بل کہ اس کا اختصاص بھی پرانی اور تاریخی عمارات کی حفاظت اور تعمیر و تزئین نو ہے اور اس موضوع پر فی الوقت اس کا شمار ماہرین میں ہوتا ہے مگر میرے نزدیک اس بات کا دوسرا حصہ یعنی ان مزارات کی تاریخ، نوعیت، ان سے متعلق متولیوں کی مفاد پرستی اور عوام الناس کی ان قبروں میں آسودہ بزرگوں کی نسل در نسل زندہ لوگوں سے زیادہ تعظیم کرنا ہے۔ اگر چہ ناول میں زیادہ تر مسائل کا ذکر اس کے مرکزی موضوع یعنی بی بی پاک کے مزار، اس کی تاریخ، ملحقہ قبرستان اور مختلف ادوار میں اس کی آڑ میں کی گئی مفاد پرستی ہے مگر روحانیت اور دنیا داری اور مجاز اور حقیقت کے حوالے سے کی گئی باتیں بہت اہم اور قابل فکر ہیں۔

کتاب کے شروع میں غافر نے ایک پانچ صفحے کا بلاعنوان دیباچہ لکھا ہے جس میں اسی روحانیت، تصوف، ذہنی و قلبی کیفیت اور بعض بزرگوں کی روحانی کرامات کو عقل و دانش اور سائنس اور منطق کے معیارات پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کو ناول کے اندر بھی مختلف مقامات پر بار بار دہرایا گیا ہے۔ پہلے اس دیباچے کا ایک مختصر اقتباس دیکھیے:

"مدفنین کے لیے قبرستان بنائے جاتے ہیں مگر ذہنوں میں نقش ایسی شخصیات کے قبرستان کبھی نہیں بنتے، آخر کیوں؟.... زندہ اور مر جانے والے ہر دو طرح کے انسانوں کی شناخت کی دوسرے ذہنوں میں منتقلی کا فریضہ زندہ انسان سر انجام دیتے ہیں۔ ایسی ہی مستقل زندگی منتخب لوگوں کے لکھے ہوئے الفاظ کو بھی عطا ہو جاتی ہے جو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں"۔

ناول کے کردار علامتی بھی ہیں، فرضی اور حقیقی بھی۔ بعض جگہ ناموں کے ذریعے اور کہیں کہیں تشبیہی حوالوں کی معرفت آپ بہت سے کرداروں کو جلد یا بدیر پہچان لیتے ہیں یعنی جہاں آپ کو اقبال باہو اور پیڑھول والا وغیرہ کا براہ راست حوالہ ملتا ہے، وہاں آپ نیر علی دادا کو آرکیٹیکٹ آفتاب علی اور اُن کی نیرنگ آرٹ گیلری کی شکل میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ طارق اسمٰعیل، بابا مستان، صائمہ علی، حنیف رامے، جنڈیالہ شیر خاں کا حافظ عبدالرحمن، عبدالحمید، ذاکر خادم حسین، سیکشن افسر محمد عرفان، عرفانہ خان، سلمٰی بیگ، آغا کمال، کیتھی، بوش، سید سرار علی شاہ وہ نمایاں کردار ہیں جو اس کہانی میں مختلف حوالوں سے ظہور کرتے نظر آتے ہیں لیکن کہانی کے کسی روایتی پلاٹ کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ نہ خود آگے بڑھتے ہیں اور نہ کہانی کو آگے بڑھانے میں کوئی ایسا رول ادا کرتے ہیں جس سے کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو یا

کی Conflict کو راستہ ملے البتہ فن تعمیر، قدیم عمارات کی ساخت، ان میں استعمال ہونے والی جیومیٹری کا علم یا ان کی تعمیر میں استعمال ہونے والے قدیم مسالے اور جدید تعمیری ساز وسامان کا ذکر بڑی وضاحت، صراحت، فراوانی اور علمیت کے ساتھ اس قدر تکرار سے کیا گیا ہے کہ بعض اوقات کہانی، کردار اور واقعات سب کے سب اس تکرار میں گم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ زندگی اور موت کے فلسفے، حقیقت اور مجاز اور ''گور پیا کوئی ہور'' کا حوالہ بار بار آتا ہے مگر یہاں خاقر شہزاد کا قلم ایسی گہرائی میں جا کر اور اس نفاست سے تصویر کشی کرتا ہے کہ کئی جملے جیسے ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں، جیسے وہ لکھتا ہے:

''مغربی دنیا میں سالگرہ منائی جاتی ہے۔ انسان کا یوم پیدائش مسرت کا سبب ہوتا ہے مگر مشرق میں ان روحانی شخصیات کا یوم وصال منایا جاتا ہے، مشرق اور مغرب میں یہی بنیادی فرق ہے''۔

''ارسلان نے زمان اور مکان کی تھیوری کلاس میں پڑھی تھی مگر کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقت کہیں رک جاتا ہے جیسا کہ مکلی کے قبرستان میں ہوا تھا''۔

''ہندستان کے مسلمان اب بھی اپنے ذہنوں میں بت بناتے ہیں، شخصیت پرستی کرتے ہیں، تعمیرات میں مزارات، مقابر اور ان کی عمارتوں کی الگ شناخت بنتی ہے''۔

''انہیں لوگ اپنے حافظے میں مرنے کیوں نہیں دیتے''۔

''یہ زندگی کون سی ہے جو یہ اب جی رہے ہیں؟ یا وہ زندگی جو انہوں نے مرنے سے پہلے جی، وہ کون سی تھی۔ یہ اصل ہے جو لوگوں کے دلوں میں دائم رہے گی یا وہ اصل تھی جو گزارنے کے بعد یہ لوگ عام انسانوں کی طرح زیر زمین دفن ہو گئے''۔

اس طرح کے اور بہت سے جملے ہیں جن میں دانش کے جہان آباد ہیں مگر سب سے زیادہ جس منظر نے مجھے اپنی گرفت میں لیا وہ مکلی میں ہونے والی کانفرنس کا وہ لمحہ ہے کہ جب بظاہر سیشن ختم ہو چکا ہے لیکن ارسلان اپنی چشم تصور میں 1961ء کے نوبل انعام یافتہ ناول نگار آئیو واندرچ کے مشہور ناول "The Bridge on the Darina" کے ایک کردار ریڈی صاف کو وہ تقریر کرتے ہوئے دیکھتا اور سنتا ہے جس میں اس نے اپنے علاقے اور لوگوں کی حفاظت کے لیے آواز بلند کی اور جس کے نتیجے میں اس کے زندہ جسم کو بانس میں پرو کر بے حد اذیت ناک انداز میں مارا گیا۔

''مکلی میں مرگ'' روایتی معنی میں ناول ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ تو محققین اور نقاد حضرات کریں گے میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ کتاب علامت اور حقیقت کا ایک ایسا دلچسپ مجموعہ ہے جسے اپنے آپ کو پڑھوانا آتا ہے اور یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

☆☆☆☆☆

''شجر کہانی'' میری نظر میں

ساجد علی امیر

" شجر کہانی "اسد سلیم شیخ صاحب کی اشجار اور فطرت سے محبت کا اظہار ہے۔ جو اسد صاحب اور اشجار کے مابین اپنائیت کے رشتے کو اجاگر کرتی ہے۔ اسد صاحب اشجار سے اپنے دیگر دوستوں کی طرح کلام کرتے ہیں اور اشجار بھی گفتگو کے دوران ان سے بے تکلف دوستوں کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اس سے اسد صاحب اور اشجار کے درمیان مکالمہ تشکیل پاتا ہے۔ جس کی بدولت اشجار کو زبان مل جاتی ہیں اور وہ انسانوں کی طرح ناطق بن جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے اساطیری کہانیوں میں اشجار انسانوں سے کلام کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن " شجر کہانی " میں اشجار کی گفتگو کا انداز اساطیری کہانیوں سے الگ اور منفرد ہے ۔ جو اسد صاحب کے گہرے مشاہدے تجربے اور وسیع مطالعہ کا غماز ہے۔

" شجر کہانی "اسد صاحب کو ماہر نباتات کے طور پر متعارف کرواتی ہے۔ اسد صاحب اشجار کی مختلف خاصیتوں اور ان کے مزاج سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں ۔وہ بڑی چابکدستی سے اشجار کی ضروت ، اہمیت اور افادیت کو بیان کرتے ہیں۔

دراصل " شجر کہانی "اشجار کے وجود کی سیاحت کی ڈائری ہے ۔جس میں اسد صاحب پہلے اشجار کے وجود میں خود اترتے ہیں اور پھر ان کی زبانی اپنی بات کہتے ہیں۔ جس سے " شجر کہانی " محض معلومات کا ذخیرہ نہیں رہتی بلکہ فکشن کا روپ اختیار کر لیتی ہیاور تحقیقی اور تالیفی کاوش ہونے کے باوجود تخلیقی کاوش کا تاثر دیتی ہے۔

" شجر کہانی " کا اسلوب بہت جاندار اور ادبی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسد صاحب کی اس کاوش کے امر ہونے کے تمام ممکنہ امکانات موجود ہیں اور یہ زمانے کی دھول سے محفوظ رہے گی۔

اسد صاحب نے " شجر کہانی " کی ابتدا میں بہار کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ جس میں انھوں نے منظر نگاری کے تمام لوازمات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ شجر کہانی کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے کہ مارچ کا آخری ہفتہ ہے اور بہار اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ جلوہ فروز ہے۔ جس سے اسد صاحب کا جی چاہتا ہے کہ وہ اشجار (جو فطرت کے حسن کے عکاس ہیں) سے مکالمہ کریں ۔اسد صاحب کا اشجار سے مکالمہ دراصل فطرت کے حسن سے مکالمہ ہے۔ وہ اپنے اس مکالمے کا آغاز کالج کے ایک شجر سے کرتے ہیں۔ جو کالج کے دیگر اشجار سے ہوتا ہوا ان اشجار تک جا پہنچتا ہے جو انھوں نے مختلف جگہوں کی سیاحت کے دوران دیکھے ہیں۔

اسد صاحب اشجار سے مکالمہ کرتے ہوئے ان سے

جڑی ماضی کی یادوں کو تازہ کر دیتے ہیں۔ جب کبھی مکالمے کے دوران انھیں بوریت اور یکسانیت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اشجار سے جڑے کسی ایسے واقعہ یا کردار کو سامنے لاتے ہیں جس سے تحریر میں افسانویت پیدا ہو جائے۔ اسد صاحب اشجار سے مکالمے کے دوران اشجار سے جڑے اساطیری، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی تصورات کو دریافت کرتے ہیں۔

کوئی بھی کہانی ہو وہ کرداروں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بظاہر تو "شجر کہانی" میں اشجار کے روپ میں بہت سے کردار ملتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں "شجر کہانی" میں ایک ہی کردار ہے اور وہ کردار ہے اسد صاحب کا ہے۔ باقی سب کردار تو اس کردار کے تخیل اور معلومات کی ترسیل کا فقط ذریعہ ہیں۔ اسد صاحب کا کردار پوری "شجر کہانی" پر چھایا ہوا ہے۔ اس کردار کے علاوہ جو اشجار کے کردار ہیں وہ کردار نگاری کے لوازمات کو پورا نہیں کرتے۔

ہاں اگر اسد صاحب اشجار کا مکالمہ آپس میں کرواتے اور کسی ایک شجر کے گرد باقی تمام اشجار کی کہانی کو بن دیتے تو یقیناً اشجار باقاعدہ طور پر کردار بن سکتے تھے لیکن ایسا کرنے سے شجر کہانی کی تخلیق کا مقصد پس پشت جا سکتا تھا شاید اسد صاحب نے اس قباحت سے بچنے کے لیے اشجار کا مکالمہ آپس میں نہ ہونے کے برابر کروایا ہے۔ بر حال اسد صاحب کی یہ کاوش قابل تعریف ہے جو یک کرداری ہونے کے باوجود کہانی کا پورا تاثر دیتی ہے۔

اسد صاحب اشجار کے لیے ماں جیسی ممتا رکھتے ہیں۔ جب اشجار ان سے ماحول دشمن عناصر کی شکایت کرتے ہیں تو وہ ماں کی طرح ان سے لاڈ پیار کرتے ہیں۔ ان کا حوصلہ اور ہمت بڑھانے کے ساتھ ان کو بتاتے ہیں کہ جیون کی جنگ میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ ان کے بہت چاہنے والے بھی شامل ہیں۔

"شجر کہانی" اسد صاحب کی شخصیت کے رومانوی پہلو کو بھی آشکار کرتی ہے۔ اسد صاحب اشجار سے مکالمہ کرتے ہوئے ان کے احساس مروت میں ایسے ہی کھو جاتے ہیں جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی آنکھوں کے نیلے سمندر میں اتر جائے۔ بعض اوقات تو اسد صاحب اشجار کو شعر سنا کر ان کو خوش کرتے ہیں جس سے اسد صاحب کے شعری ذوق کا بھی پتا چلتا ہے۔

"شجر کہانی" اسد صاحب کی شخصیت کے فلسفیانہ پہلو کو بھی دریافت کرتی ہے۔ ایک جگہ پر اسد صاحب سرو کی زبانی کہتے ہیں کہ "جس کا زمین سے رشتہ نہیں رہتا وہ کہیں کا بھی نہیں رہتا۔" یہاں زمین سے مراد اساطیرت، تاریخ، تہذیب، تمدن، ثقافت اور مذہب لیا جا سکتا ہے کیونکہ انسان کا تعلق جب ان چیزوں سے ٹوٹ جاتا ہے تو اسے تخلیق توانائی نہیں ملتی جس وجہ سے اس کا ذہن بانجھ اور اس کی پہچان مٹ جاتی ہے۔

دنیا کی ہر زبان کے ادب میں اشجار مختلف جزبات کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ شجر کہانی میں اسد صاحب نے اشجار کے استعاراتی پہلوؤں پر بھی بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔

☆☆☆☆☆

تصوّرِ اقبال ''گلاب بصد آب'' سے ''تصوّرِ حرا'' تک

دِل کو موہ لینے والے، انتہائی سادہ لوح، کم گو، پیکرِ خلوص شاعر تصوّر اقبال ضلع اٹک کی ایک تحصیل پنڈی گھیپ میں رہتے ہیں اور شہروں کی چکا چوند اور شور شرابے سے الگ تھلگ رہ کر خاموشی اور سکون کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ملازمت کے دوران بھی ان کا قلم رواں دواں تھا اور تعلیمی شعبے سے ریٹائر ہونے کے بعد تو بلاشبہ وہ ہمہ وقتی شاعر ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ان کے شعری مجموعے ''گلاب بصد آب'' کا مسودہ مجھے پیش لفظ لکھنے کے لیے موصول ہوا مگر میں اپنی ذاتی پریشانیوں اور بیماریوں کے سبب کچھ تاخیر کا مرتکب ہو گیا۔ مگر کوئی کب تک انتظار کرے، چنانچہ یہ کتاب شائع ہو کر ایک روز بذریعہ ڈاک مجھے موصول ہوئی تو خوشی کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔ کچھ شرمندگی دور کرنے کے لیے میں نے اس پر ایک اخبار میں کالم بھی لکھ دیا، جس میں کچھ عروضی و فنی معاملات پر ہلکا سا تبصرہ بھی کیا۔ ابھی اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کر ہی رہا تھا کہ ان کا نعتیہ مجموعہ ''تصوّرِ حرا'' بھی آ پہنچا جس کے اندر ان کے خط میں لکھا تھا کہ سب سے پہلے کتاب آپ کو بھیج رہا ہوں، جب تک آپ اسے فنی لحاظ سے ''پاس'' نہیں کریں گے، میں یہ کتاب دوستوں میں نہیں بانٹوں گا۔ انہوں نے چونکہ مجھ پر ایک بھاری ذمہ داری ڈال دی تھی اس لیے آنکھوں میں تکلیف ہونے کے باوجود دو دن میں مَیں نے یہ کتاب پڑھ بھی لی اور بقول تصور اقبال 'پاس' بھی کر دی۔ اب کسی حد تک حالات بہتر ہونے پر میں ان دونوں کتابوں پر اپنے مضامین لکھ کر ان کی خاص فرمائش پر ماہنامہ بیاض کو بھیج رہا ہوں جو امید ہے کہ کسی قریبی اشاعت میں شائع ہو جائے گا۔

نسیمِ سحر

۱۔ ''گلاب بصد آب''

اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایسے تغزل سے بھرپور اور عمدہ اشعار والے ضخیم مجموعے کم کم ہی شائع ہوتے ہیں۔

مصنف کی عمر اور واردات عشق کا اظہار انہی کے ایک شعر کے ذریعے واضح ہوتا ہے:

ساٹھ برس کے بعد حقیقت سمجھا میں
یعنی عشق میں کھا بیٹھا ہوں دھوکا میں

.....

یہاں اِس کتاب کا تعارف مقصود ہے، اِس کے فنی و عروضی معاملات پر بحث یا تنقید کرنا مناسب بھی نہیں اور کتاب میں اس حوالے سے کچھ بہت زیادہ قابلِ گرفت اشعار بھی نہیں ہیں، اس لیے ہم شاعر کے کچھ مثبت شعری خواص بیان کرنے کے بعد ان کے کچھ اچھے اشعار پر بات کریں گے۔ یہ مجموعہ ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اچھی جلد اور مناسب کاغذ کے ساتھ۔ مناسب اس لیے کہا گیا کہ اس دور میں اچھے کاغذ کا استعمال اُن ادیبوں کے لیے تو ممکن ہی نہیں جو اپنی محدود آمدن سے خود ہی کتاب شائع کروانے کا کشٹ اُٹھاتے ہیں، اور پھر مفت ہی تقسیم کرتے ہیں کہ فاسٹ فوڈ اور شنواری ریستورانوں میں ہزاروں خرچ کرنے والے ایک کتاب خریدنا بارگراں سمجھتے ہیں۔ سرورق پر گلاب کی خوبصورت تصویر اور اس پر بصد آب کی علامت شبنم کے قطروں کی صورت میں ہے، کتاب کا نام بھی گلاب ہی کے رنگوں میں لکھا ہے۔ ناشر کا نام اردو سخن ڈاٹ کام ہے۔ انتساب بھی تصورِ اقبال کی عمر اور صورتِ حال کی ترجمانی کرتا ہے۔ کہتے ہیں'' اپنے والدین اور بہنوں کے نام، اور ہر اُس فرد اور جمند کے نام جس نے ابتلا اور علالت کے دنوں میں مجھے حیات نو کی دعا دی''۔ ایک حمد، ایک نعت اور ایک سلام کے بعد باقی کے تمام صفحات پر تصورِ اقبال کی ۱۴۸ غزلیں گلاب در گلاب کھلا رہی ہیں۔

حیرت انگیز طور پر کتاب میں کسی کا دیباچہ شامل نہیں، جبکہ سابقہ کتابوں میں تو بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی آراء شامل ہوتی تھیں، اسے جناب تصور اقبال کی خود اعتمادی ہی سمجھیے کہ کتاب کی پشتِ سرورق پر صرف ڈاکٹر سید قاسم جلال کی رائے درج ہے جس میں انہوں نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے کہ ''اُن کے افکار پر اسلامی افکار کا رنگ غالب ہے جو قاری کو گاہے گاہے زندگی کی اعلیٰ اور مثبت قدروں کی جانب راغب کرتا ہے۔۔۔ تصور اقبال کی غزلیں اُن کے اخلاقی اقدار کو اُجاگر کرنے والے اشعار سے معمور ہیں۔ ایسے اشعار کثرت سے لکھنے والے شاعر کو بے شبہ 'شاعرِ صداقت شعار'

کہنا چاہیے"۔

راقم السطور اس کتاب کا بالاستیعاب 'مطالعہ کرنے کے بعد اپنی پہلی رائے کا اعادہ کرنا چاہتا ہے کہ شاعری میں ان کا اپنا الگ لب و لہجہ ہے، اور وہ خاصا وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود کسی اَور سے متاثر نہیں ہیں۔ تصور اقبال کا تعلق دیہات سے ہے، دیہات میں سادگی اور خلوص خالص غذا کی طرح اور تازہ آکسیجن کی طرح میسر ہوتا ہے، یہی سادگی خلوص اور بے لاگ بات شعری انداز میں کہنے کا ہنر تصور اقبال نے بھی سیکھا ہے۔ انہوں نے شعوری طور پر اردو زبان میں اپنی ماں بولی پنجابی کے الفاظ خوبصورتی سے شامل کیے ہیں، یوں انہوں نے نہ صرف اپنی ماں بولی سے محبت کا اظہار کیا ہے بلکہ اردو زبان کا دامن بھی وسیع کیا ہے کہ اردو زبان کے موجودہ پھیلاؤ میں ایسے ہی شاعروں اور ادیبوں کا حصہ ہے۔

مذہب، تعلیماتِ اسلامی پر عمل کی اہمیت اور مسلکی معاملات میں اختلافی پہلوؤں سے بچنے کے نازک موضوع پر تصورِ اقبال نے بڑی احتیاط سے قلم اٹھایا ہے:

ہوا کا بھی گزر ہے روشنی بھی اس سے ملتی ہے
اذاں بھی اب سنائی دے رہی ہے اک دریچے سے

اس کو سکون قلب کہیں بھی نہیں ملا
جو شخص دور ہو گیا دین مبین سے

یہی سچ ہے کہ جب سے نعت خواں آئے ہیں لالچ میں
نہیں ہے اب وہ پہلے سی نزاکت نعت خوانی میں

.....

دیتا ہے مثالیں تو اکائی کی زمانہ
اس ایک قبیلے کے مگر چار دھڑے تھے

.....

رب کا حصہ جو دیتے نہیں آج ہم
اس لیے کوئی برکت نہیں مال میں

.....

ہماری اسلامی اقدار کے زوال کے علاوہ تصور اقبال نے عہدِ حاضر کے انسان کو درپیش دیگر مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے اور مہنگائی کے علاوہ بھی کئی موضوعات پر شعر کہے ہیں، یہاں اُن کے صرف دو شعر پیش کیے جا رہے ہیں، اور دیکھیے کہ دوسرے شعر میں کسی زمانے میں پاکستان میں مستعمل سکّوں کا ذکر بھی پنجابی کے ایک لفظ 'چوانی'' کے ذریعے کس خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے، حالانکہ اردو میں اسے چونّی بھی کہا جا سکتا تھا (آجکل تو یہ سکہ ناپید اور متروک ہو چکا):

یہ سوال اپنا تصوّر آج دہرائیں گے ہم
عہدِ نو کے آدمی کو کیا جگا پائیں گے ہم

.....

ہزاروں پاس ہیں پھر بھی گزارا اب نہیں ہوتا
کبھی ہوتی تھی برکت بے بہا صاحب، "چوانی" میں

.....

غمِ جاناں، ہجر و وصال، محبوب کی بے وفائی جیسے معاملات پر بھی شاعر کا بیانیہ ملاحظہ ہو:
کچھ تو ان کی بے رخی کا شاخسانہ بھی ہے یہ
اپنے ہی گھر میں تصوّر ہم جو بے گھر ہو گئے

.....

کہا تھا نا تجھے میں نے ترا دل ٹوٹ جائے گا
کہا تھا نا تجھے میں نے نہ رہنا خوش گمانی میں

.....

وہ بھی سائے کی صورت ہمیشہ رہا
جس طرف میں گیا میرا سایا گیا

.....

عبادت میں بھی اب ایسے مخل ہوتا ہے وہ کافر
کبھی قعدہ مکمل ہو تو سجدہ بھول جاتا ہوں

.....

میں نے تحفے میں اس کو محبت ہی دی
اس نے نفرت کی بھیجی ہے شال آج بھی

.....

تصور اقبال ہماری طرح پرانے دور کے آدمی ہیں مگر نئے دور پر ان کی گہری نظر ہے، ذرا دیکھیے نئے دور کے تقاضے انہوں نے کس خوبی سے جدید لہجے میں بیان کیے ہیں، آخری شعر میں خاص طور پر صنفِ غزل پر ان کا تبصرہ دیکھیں:
کوئی کہتا ہے میسج کر، کوئی کہتا ہے نیٹ پر آ
مشینی دور میں قرطاس پر رہنا نہیں اچھا

.....

جب سے اُس نے کیا رابطہ منقطع
اب نہیں ہے کشش کوئی مِس کال میں
کچھ تو کمی ضرور تھی تیرے سلوک میں
ہم کھو گئے جو کرب کی سیف الملوک میں

.....

تخیل کو بھی ارتقا چاہیے
غزل کو نیا قافیہ چاہیے

.....

ماں جیسی عظیم ہستی پر کئی شعراء نے بلاشبہ بڑے اچھے شعر کہے ہیں، ہمارے خیال میں تصوّر اقبال کا یہ شعر اگر ان اشعار سے بہتر نہیں تو کسی طور کمتر بھی نہیں ہے:
ایک مدت سے بیمار ہے میری ماں
ایک مدت سے میں مسکرایا نہیں

.....

تصور اقبال ریاضتِ فن میں کئی عشرے گزارنے کے بعد اب قافیوں ردیفوں کے استعمال میں کچھ اتنے رواں ہو چکے ہیں کہ اس کتاب میں ان کی چند طویل غزلیں جو پندرہ پندرہ اور اٹھارہ اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہیں، وہ مطلع سے لے کر مقطع تک تمام کی تمام مطلعوں پر ہی مشتمل ہیں۔ نمونے کے طور پر ایسی ایک غزل کا مطلع اوّل اور مقطع ملاحظہ ہو جسے پندرھواں مطلع بھی کہا جا سکتا ہے۔
راز دل جب کسی سے چھپائے گا وہ
سچ تو یہ ہے اذیت اٹھائے گا وہ
ابر بن کر مرے سر پہ چھائے گا وہ
پیاس کیونکر تصوّر بجھائے گا وہ

.....

ان کے ہاں پنجابی الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ گاہے گاہے انگریزی اور ہندی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ ایسے کچھ اشعار میں البتہ مزاحیہ رنگ غالب ہے جس سے شعر کی سنجیدگی متاثر ہوتی ہے۔ کچھ ٹیٹ لیجے کے شعران کے علاقے انک کی ترجمانی بھی کرتے ہیں:

ارادہ کر لیا ہے اب جو گل پوری نہیں ہوتی
کسی صورت بھی اپنے دل میں وہ ٹھانی نہ جائے گی

.....

تصورِ اقبال کا تخلیقی سفر آج کے بہت سے عمر رسیدہ شعراء کی نسبت خاصی تیزی اور فنی رچاؤ کے ساتھ جاری ہے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور ان کے تخلیقی سفر میں برکت عطا فرمائے۔

۲۔ تصوّرِ اقبال کا نعتیہ مجموعہ ''تصوّرِ حرا''

اِس مرتبہ ماہِ رمضان میں شائع ہونے والے حمدیہ و نعتیہ مجموعوں کی تعداد حیرت انگیز حد تک کافی زیادہ ہے، اور گذشتہ کئی برسوں میں ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔ شاید اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حمد و نعت گو شعراء بھی معاشرے کے فرد کی حیثیت سے کورونا کی مہلک وباء کے خوف میں مبتلا ہیں اور یوں ان کا روحانی اور ذہنی رجحان حمد و نعت کی جانب زیادہ ہو گیا ہے، مزید یہ کہ کورونا کی وجہ سے سماجی اور ادبی سرگرمیاں عملاً تقریباً معطل ہو کر رہ گئی ہیں اس لیے تخلیقی شعراء کو حمد و نعت لکھنے کے لیے خاصا وقت مل گیا ہے۔ جو بھی ہو، اللہ کا کرم اور عنایت ہی ہے کہ اس کے اور اس کے محبوب رسولِ اکرم سے اظہارِ عشق و عقیدت کا سلسلہ بدستور وسعت پذیر ہے۔

حال ہی میں راقم السطور کو جناب تصور اقبال کا تازہ ترین نعتیہ مجموعہ ''تصوّرِ حرا'' موصول ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمہ وقتی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں کہ ادھر میں نے ان کی ''گلاب بصد آب'' پر کالم لکھا، اگلے ہی روز ان کا نعتیہ مجموعہ موصول ہو گیا، گویا وہ ایک کتاب کے شائع ہونے کے دوران میں بھی بیک وقت دیگر کئی تخلیقی جہات میں مصروف رہتے ہیں۔ ماضی قریب سے ہی ان کا زیادہ تر رجحان حمد و نعت کی جانب زیادہ محسوس ہو رہا ہے۔

۱۴۶ صفحات کی ضخامت پر مشتمل اور عمدہ جلد کے ساتھ ساتھ ''تصوّرِ حرا'' کا سرورق مدینہ طیبہ کی بصیرت انگیز تصویر کے ساتھ ساتھ غارِ حرا کا عکس بھی پس منظر میں دکھا رہا ہے گویا ''تصوّرِ حرا کا تصوّر جس طرح غارِ حرا سے اٹھا اور دنیا بھر میں پھیل گیا اُس کی ترجمانی سرورق سے بھی ہو رہی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ تو ساری کتاب ہی اس عظیم ہستی کی ثناء پر مشتمل ہے جس پر جبریلِ امیں اولیں وحی لے کر غارِ حرا میں حاضر ہوئے تھے۔ چنانچہ ''تصوّرِ حرا'' میں مصنف تصور اقبال کے مختلف اشعار میں لفظی اور عقیدتی اظہاریوں

میں غارِ حرا کے ساتھ ساتھ حضرت محمدؐ ہی کا ذکرِ خیر ہے تو یوں تو ہونا ہی تھا۔

اس کتاب کا انتساب حضرت پیر نصیر الدین نصیر گولڑوی کے نام کیا گیا ہے جنہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے تصور اقبال نے عمدہ شعری اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:

ہفت زباں وہ شاعر اک جو ہے آسودۂ خاک
مجھ ایسوں کو بخشا اُس نے ہستی کا ادراک

....

کتاب کا آغاز سورۃ الرحمٰن کی آیات کے منظوم مفہوم سے ہوتا ہے، مصنف نے انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس عمدہ نظم کو سورۃ الرحمٰن کے قریب تر ہونے کے باوجود اسے منظوم مفہوم ہی کہا ہے، ترجمہ نہیں کہا کہ ترجمہ کرنے میں اصل متن سے معمولی سا فرق بھی آجائے تو یہ باعثِ گرفت ہو سکتا تھا۔ ان کی اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

اپنی رہ سے ہٹ کے مت چل ہو کر لاپروا
اس دن کو بھی ذہن میں رکھ لے جب تھا خاک نما
کس نے اپنی قدرت سے پھر تجھ میں رنگ بھرا
اپنی اس آزاد خیالی سے تو کب شرمائے گا
اپنے رب کی کس کس نعمت کو آخر جھٹلائے گا؟

....

سورۃ الرحمٰن کے منظوم مفہوم کے بعد تصور اقبال کے کچھ عمدہ حمدیہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

کُن کی کنجی سے مشکل کو آساں کیا
جب بھی آیا کبھی وقت ہم پر کڑا

دل میں تیری ہو الفت، تصور ترا
عمر جتنی ہے، جتنے ہیں دن اے خدا

....

ہر گام بصد ہوش کہ یہ شہرِ نبیؐ ہے
ہاں دل کا دھڑکنا بھی یہاں بے ادبی ہے

....

غارِ حرا سے منسوب دو بہت اچھے شعر بھی دیکھیے:

پھر تصور میں آتی ہے پہلی وحی
تذکرہ جب بھی غارِ حرا کا کروں

....

وہی غارِ حرا ہے اب مری چشمِ تصور میں
جہاں میرے نبیؐ مشغول رہتے تھے تفکر میں

....

تصور اقبال کی اس کتاب میں جو چیز کچھ دوسروں سے الگ سی نظر آئی وہ یہ کہ انہوں نے اپنے شعروں میں کثرت سے اسلامی اور قرآنی تلمیحات کو تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے اور یوں انہوں نے قرآن اور تاریخِ اسلامی کے گہرے مطالعے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ کچھ تلمیحی اشعار دیکھیے:

جڑ سے اکھڑ کے بھی جو چلا آیا تھا شجر
سچ پوچھتے ہیں آپ تو حجت تمام ہے

....

سنگ ریزے کریں گفتگو آپ سے
آپ اُمی لقب، حسنِ ارض و سما

....

چاند اک پل میں دو لخت آخر ہوا
ان کی انگلی کے گویا اشاروں میں ہے

اپنے پاؤں زمیں پر وہ رکھتی نہیں
اونٹنی جب حلیمہ کے گھر آئی ہے

.....

ہم کو درسِ قناعت بھی اُنؐ سے ملا
کچھ نہیں تھا تو پتھر ابالے گئے

.....

عشقِ احمدؐ کا دلکش حوالہ ہے وہ
دیکھنے میں تو مکڑی کا جالا ہے وہ

.....

کتاب میں سے کچھ مزید نعتیہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

قلم میں روشنی ساری بفیضِ نعت ہوتی ہے
تصور ہوں، تصور میں بھی بس وہ ذات ہوتی ہے

.....

ان تریسٹھ برس پر بھی کچھ غور کر
تذکرہ کر کبھی اُنؐ کی ہر بات کا

.....

یہ نعتِ نبی کی رمق دیکھ لو
ہے آنکھوں میں کتنی چمک، دیکھ لو

.....

پوری دنیا اس وقت جس وبائی عذاب میں گرفتار ہے اور جس انداز میں لوگ گڑگڑا گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے اس سے نجات کی دعا کر رہے ہیں، شعراء بھی اپنے اپنے انداز میں دعائیہ شعر کہہ رہے ہیں، تصور اقبال دیگر اشعار کے علاوہ اپنی ایک نظم میں یوں کہتے ہیں:

اے زمین و زماں کے خدا
سن ہماری بھی اک التجا

.....

ہر طرف ہے کرونا وبا
جس کی کوئی نہیں ہے دوا

.....

موت کی چل پڑی ہے ہوا
زندگی دے رہی ہے صدا

.....

حمد و نعت کے علاوہ اس کتاب میں ایک منقبت در شانِ علی، دو عدد سلام بحضور امامِ عالی مقام، ایک منقبت در شانِ مہر علی، اور باب سلیم کے عنوان سے ایک نظم حضرت پیر نصیر الدین نصیرؒ کی شان میں ہے۔

اس نعتیہ کتاب کا فلیپ نامور دانشور اور قلمکار ڈاکٹر سید قاسم جلال نے لکھا ہے۔ ان کی زرّیں تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو: "۔۔ اگرچہ اس سے قبل بھی ان کی کئی کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں لیکن موجودہ کتاب اپنے موضوعات (حمد و نعت، سلام، منقبت) کے حوالے سے منفرد اور موصوف کی زندگی کا شاندار کارنامہ ہے۔ عشقِ الٰہی اور حبِ رسولؐ سے شاعر کا دل منور ہے جس کے نتیجے کے طور پر ہر شعر میں عقیدت و محبت کی حلاوت، بے ساختگی اور والہانہ پن کے ستارے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔۔ تصور حرا کا اسلوبِ بیاں نہایت سادہ اور رواں دلکش اور پُر تاثیر ہے۔۔"

☆☆☆☆☆

ناشکرے لوگ: آخر کیوں؟

''ناشکرے لوگ'' اعجاز احمد فکرال کا ناول ہے۔ یہ ناول لے کر جب وہ مجھے ملنے آیا تو اس کا گلہ یہی تھا کہ ادبی دنیا کے نامور ادیب شاعر اس کے ناول اور افسانے پڑھتے نہیں ہیں، اگر وہ اس کا کوئی ایک ناول بھی پڑھ لیں تو انہیں اندازہ ہو کہ وہ کس پائے کا ناول نگار ہے۔ جتنی دیر وہ میرے پاس بیٹھا رہا، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ بظاہر سادہ دکھائی دینے والا اعجاز احمد فکرال اپنے گردوپیش کے ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر بہت گہری نگاہ رکھتا ہے، اس بات کا اندازہ تو مجھے اس کی گفتگو سے اسی وقت ہو گیا تھا۔ وہ میرے لیے دو ناول لے کر آیا تھا، ایک ''ناشکرے لوگ'' اور دوسرا ''بگ باس''۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ مجھے اگر ان میں سے کسی ایک ناول کو پڑھنے کی خواہش ہو تو میرا انتخاب کیا ہونا چاہیے۔ وہ پورے اعتماد سے بولا: ''ناشکرے لوگ''۔

''ناشکرے لوگ'' بڑے سائز پر شایع ہونے والا ناول 320 صفحات پر مشتمل ہے جسے اگر عام کتابی سائز پر شایع کیا جاتا تو اس کی ضخامت بہ آسانی 640 صفحات پر پھیل جاتی۔ ناول کے لیے اعجاز احمد فکرال نے آزاد جموں کشمیر کے شہر چکوٹھی کی لوکیشن کا انتخاب کیا ہے جو سرسبز و شاداب پہاڑوں کے دامن میں ایک چھوٹی سی وادی ہے جہاں لوگوں کی اکثریت ایک ہی قبیلے سے ہے۔ لاہور شہر میں رہنے والا کم ہی چکوٹھی کے قدرتی منظر نامے کو بیان کرنے کے حوالے سے انصاف کر سکتا ہے۔ معلوم نہیں اعجاز احمد فکرال وہاں کئی دن رہا ہوگا کہ اس نے وہاں کے لوگوں، گھروں، بستی، لینڈ اسکیپ اور زندگی کی ایسے بھرپور طریقے سے منظر کشی کی ہے کہ اسے پڑھ کر قاری تحیر زدہ ہو جاتا ہے۔ انسانوں کے علاوہ اس وادی کے لینڈ اسکیپ نے اس ناول میں قاری کی دلچسپی کا بہت سامان بہم پہنچایا ہے۔

ناول کے آغاز میں کہانی ایک خاندان سے شروع ہوتی ہے کہ جس کے سربراہ کے مرکزی کردار بابا رشید جدون کے ساتھ اس

غافر شہزاد

کے تین بیٹوں (عبداللہ جدون، رضا حسین، دیوان) اور ایک بیٹی پلوشہ کی بات ہوتی ہے۔ اسی سالہ بابا رشید جدون خشک میووں کا کاروبار کرتا تھا۔ ان میں سے عبداللہ جدون ایک سرکاری افسر ہے، دوسرا بیٹا رضا حسین دکان پر بیٹھتا ہے جب کہ تیسرا بیٹا دیوان کم پڑھا لکھا، مگر جسمانی طور پر مضبوط اور محبِ وطن کردار ہے۔ دیکھا جائے تو یہ دیوان نامی شخص ہی ناول کا مرکزی کردار ٹھہرتا ہے۔ جب دیوان کی دوستی ریحان سے ہوتی ہے تو کہانی میں کئی موڑ آتے ہیں۔ دونوں کی دوستی کی بنیادی وجہ شطرنج کے کھیل میں دلچسپی ہے۔ شطرنج کے کھیل کے بیانیے میں ہوں لگتا ہے کہ ناول نگار کو خود بھی اس کھیل پر کافی مہارت رہی ہے۔ اسی طرح جب گھوڑوں کی ریس کا ذکر ناول میں ہوتا ہے تو ناول نگار نہایت چبک دستی اور ماہرانہ انداز میں اس کھیل کے نشیب و فراز بیان کرتا ہے۔

ریحان کو مال و دولت کمانے کی حرص اور لالچ ایک متحرک مگر قابلِ نفرت کردار بنا دیتی ہے مگر یہ کردار اپنا سب کچھ کھونے کے بعد ہمدردی کے لائق بھی ٹھہرتا ہے۔ ریحان کی بیوی نازنین ہے جسے طلاق دینے کے بعد وہ ملکہ سے شادی کرتا ہے جس کے سبب وہ کئی مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ دولت کمانے کی دھن میں وہ الیکشن بھی لڑتا ہے، اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ ریحان بچپن کے دوست پراپرٹی ڈیلر کرزئی کے ساتھ ملتا ہے جو اسے بستی کی زمین کا مالک بنانے کے لیے یہ تجویز دیتا ہے کہ اگر دریا کے بہاؤ کا رخ بستی کی طرف موڑ دیا جائے تو اس جگہ پر وہ چائے کاشت کر کے ارب پتی بن سکتا ہے اور وہ اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کرزئی کے ساتھ سودے بازی بھی کر لیتا ہے۔ یہ منصوبہ ان کا کامیاب بھی ہو جاتا ہے مگر پھر پکڑے جانے کے خوف سے ریحان کرزئی کو روڈ ایکسیڈنٹ میں مار دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اوپر آسمانوں پر بیٹھا سب سے بڑا منصوبہ باز کچھ اور طرح کی پلاننگ کیے ہوئے ہے کہ جس تک رسائی انسانوں کے بس کی بات نہیں۔

ناول کے تین بنیادی حصے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اپنی جگہ یہ تین ناول بنتے ہیں، چوں کہ ان تینوں حصوں میں کردار مشترک ہیں اس لیے کہانی کچھ مختلف ہو جانے کے باوجود کرداروں کا اشتراک ان تین حصوں کو باہم ملائے رکھتا ہے۔ پہلے حصے میں سیلاب آ جانے کے سبب بستی پانی میں بہہ جاتی ہے اور اس زمین پر ریحان قابض ہو جاتا ہے کہ جو اب اس علاقے کا سیاستدان بھی ہے۔ دوسرے حصے میں زلزلہ آ جانے کے سبب بستی اور وہاں کے مکین تباہی کا شکار ہوتے ہیں۔ تیسرے اور آخری حصے میں جب اگلی نسل آتی ہے تو ناول کا منظر نامہ نارووال کی بستی ستراہ اور لاہور شہر کے تعلیمی اداروں اور ان میں تعلیم حاصل کرنے والی دیوان کی بیٹی بنفشہ کی کہانی کو

آگے بڑھاتا ہے مگر ان تینوں حصوں میں باقی کردار ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں، کہیں بھی وہ غیر فعال نہیں ہوتے۔ ناول کے ان تینوں حصوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ قدرتی وسائل سے مالا مال یہ دھرتی انسانوں کو ان کی ضروریات کا سامان باہم پہنچاتی ہے مگر جب ان کی حرص اور لالچ بڑھ جاتی ہے، جب وہ دوسروں کا حق مارنے لگتے ہیں تو قدرت جوش میں آتی ہے اور پھر ایسے کردار اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔ زن، زر، زمین کی حرص میں گرفتار لوگ یقینی طور پر اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہی ناول نگار کا مکافات عمل کا فلسفہ ہے۔ ریحان کہ جو انجام کار جیل میں ہوتا ہے اور اس نے بہت سا سرمایہ اور دولت وادی میں ایک تہہ خانے میں چھپایا ہوتا ہے اور اسے اطمینان ہوتا ہے کہ وہ جب جیل سے باہر نکلے گا تو پھر سے اپنی شاہانہ زندگی کا آغاز کر سکے گا۔ جیل میں ملاقات کرنے کے بعد دیوان اسے بتاتا ہے کہ جس جگہ وہ بتا رہا ہے کہ اس نے تہہ خانے میں دولت چھپائی ہوئی تھی، وہ جگہ بھی زلزلے کے بعد زمین کے اندر ہی کہیں دھنس گئی ہے اور اب وہاں سے دولت نکالنا یا اس جگہ کو شناخت کرنا ممکن نہیں رہا۔

ناول اپنے مواد اور کرداروں کی فعالیت کے اعتبار سے اپنے اندر بے حد رچاؤ رکھتا ہے۔ کہیں ایسا نہیں لگتا کہ کہانی کو آگے کھینچنے کے لیے کچھ غیر متعلقہ تفصیلات شامل کی جا رہی ہیں۔ جب چکوٹھی کے اس علاقے کی بات ہوتی ہے تو وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، طرز زیست اور سوچ کے بارے میں بھرپور تاثر ملتا ہے۔ جب دیوان نارو ال اپنی بیٹی بنفشہ اور دوسری بیوی نازنین (کہ جو پہلے ریحان کی منکوحہ ہوتی ہے مگر پھر اس کی دوسری شادی کے سبب اس سے طلاق لے لیتی ہے) کے ساتھ منتقل ہوتا ہے تو بنفشہ اور اس کے کلاس فیلو کی یونیورسٹی کی زندگی اور ان کی دلچسپیاں اور معاشقے بہت خوبصورت انداز سے پیش کیے گئے ہیں۔ بنفشہ کا کردار اس شہر میں مہاجر ہونے کے باوجود اپنی زمین سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور جب اس کا محبوب ایمان اسے دیار غیر میں منتقل ہونے پر مجبور کرتا ہے تو وہ اپنی محبت کو قربان کر کے باہر جانے سے انکار کر دیتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ایمان، اور اس کے والدین ایئرپورٹ پر غیر قانونی دولت اسمگل کرتے ہوئے گرفتار ہو کر جیل پہنچ جاتے ہیں اور اس کی بنفشہ سے منگنی ٹوٹ جاتی ہے۔ یہی بنفشہ اور اس کا والد اپنی دوسری بیوی نازنین کے مرنے کے بعد، واپس چکوٹھی چلے جاتے ہیں جہاں ابھی بھی آباد کاری نہیں ہوئی یہاں تک کہ بنفشہ کو اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس کے جنازے کے لیے چند لوگ میسر نہیں آتے اور وہ نماز کے لیے رکنے والے چند مسافروں سے درخواست کر کے اپنے باپ

کا جنازہ پڑھواتی ہے اور اسے دفن کرتی ہے اور پھر خود بھی زمین کے اندر دھنس جانے کے سبب اسی دھرتی میں دفن ہو جاتی ہے۔

ناول کے دو بنیادی کردار ہیں، دیوان اور ریحان۔ دونوں میں دوستی اور تعلق ہونے کے باوجود دونوں کی سوچ میں فرق ہے۔ دونوں کرداروں کا ارتقا کہانی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جسے ناول نگار نے مہارت سے نبھایا ہے۔ باقی کردار دراصل ان ہی کرداروں اور ان سے جڑی کہانی کو نبھانے کے لیے ناول کا حصہ بنتے ہیں مگر کہیں کوئی کردار غیر ضروری نہیں ملتا۔ دیوان کے علاوہ باقی تمام کردار کم و بیش دولت اور مادی آسائشوں کی لالچ کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں جن کا انجام بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ ناول کا سب سے کمزور اور محدود کردار بشیر کا ہے جو پورے ناول میں نہایت محدود ہوتے ہوئے بھی اپنی ذمہ داری نبھاتا ہے۔ بشیر جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی ماں اسے کمبل میں لپیٹ کر مسجد کی سیڑھیوں کے باہر چھوڑ جاتی ہے جہاں نمازی فیصلہ کرتے ہیں کہ اسے مائی گمی کہ جس کی اولاد نہیں ہے، کے حوالے کر دیا جائے۔ مائی گمی اسے پالتی ہے مگر جب وہ مر جاتی ہے تو علاقے کے بدمعاش مائی گمی کے ہوٹل پر قبضہ کر لیتے ہیں اور بشیر کو وہاں سے نکال دیتے ہیں۔ زلزلے کے بعد بشیر راولپنڈی کچہری منتقل ہو جاتا ہے جہاں اسے ایک نیک آدمی ملتا ہے جو اسے وہاں کی ٹائیلٹ کے ٹھیکے کے کام میں ملازم رکھ لیتا ہے۔ وہیں ایک بار عدالت میں پیش ہونے کے لیے ریحان آتا ہے اور ٹائیلٹ کے استعمال کے دوران اس کی ملاقات بشیر سے ہوتی ہے جو اس کا پیغام چکوٹھی میں دیوان کے بھائی عبداللہ جدون کو پہنچاتا ہے کہ ریحان ایک بار دیوان سے جیل میں ملنا چاہتا ہے۔ یوں یہ ایک چھوٹا اور بظاہر غیر اہم کردار اپنی سطح پر ناول کی کہانی میں ایک کلیدی کردار نبھاتا ہے۔ یہ ساری بات کرنے کا مقصد اس جانب اشارہ کرنا ہے کہ ناول نگار اپنے ناول کی کہانی اور اس کے کرداروں کے انتخاب میں بہت سوچ بچار سے کام لیتا ہے اور نہایت ذمہ داری سے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے جس سے اس کی ناول نگاری کے فن پر مہارت اور گرفت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس ناول میں 2005 کے زلزلے کے بعد چکوٹھی اور وہاں کے مقامی باشندوں کی زندگیوں پر جو اثرات مرتب ہوئے، سرسبز و شاداب وادی میں رہنے والے کیسے موت کی وادی میں اتر گئے اور جو زندہ بچ گئے ان کی زندگیاں کیسی بے بسی میں گزریں، قدرت کیسے انتقام لیتی ہے اور زندگیوں میں کیسے بدلاؤ آتا ہے، یہ ناول اس جانب تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

آگ ٹھنڈی نہ ہونے پائے

حالؔی نے کہا تھا:

قیس ہو، کوہ کن ہو یا حالؔی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

.....

جس طرح عاشقی کسی کی ذات سے مخصوص نہیں اسی طرح شاعری بھی کسی کی میراث نہیں۔ نُمو سے محروم بے آب و گیاہ بنجر زمینوں میں بھی کبھی کبھی تخلیق کی حرارت اُکساہٹ سی جگا دیتی ہے اور صحراؤں میں نخلستان لہلہا اٹھتے ہیں۔ ایسی ہی اُکساہٹ یا بے کلی ہر نوجوان کے دل میں بھی جوت جگاتی ہے۔ اُس کے جذبہ و احساس کی شاخوں پر نئے شگوفے پھوٹنے لگتے ہیں اور دل کی دھڑکنیں غیر مرتب سی ہونے لگتی ہیں۔ رنگ و بو کے ان موسموں میں ذرا سی شُد بُد رکھنے والا نوجوان، اپنے جذبوں کو شعری آہنگ میں ڈھالنے لگتا اور بزمِ خویش شاعر بن جاتا ہے۔ ایسے نوجوانوں کی بڑی تعداد کو شعری لوازمات بلکہ مبادیات تک کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ فکر و خیال کا یہ اشتباہ زیادہ دیر باقی نہیں رہتا۔ سفر وہی جاری رکھتا ہے جس کے پاس رختِ سفر بھی ہو۔ اہلِ عرب کا کہنا ہے ''الشعراء تلامیذ الرحمٰن''۔ یعنی شاعر اللہ کے شاگرد ہوتے ہیں۔ بے شک طبیعت کی موزونیت اللہ کی دین ہے۔ طبعِ موزوں سے عاری شخص کچھ بھی بن سکتا ہے، شاعر نہیں بن سکتا۔

جب اویس نے دیہاتی دلہن جیسی شرماہٹ کے ساتھ، مجھے اپنی شاعری کے بارے میں بتایا تو میں نے کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے جانا یہ کُملاتی جوانی کی

عرفان صدیقی

سنولاتی ترنگ ہوگی یا پھر کسی تازہ یا پژمردہ عشق کی کوکھ سے پھوٹتی آنچ، جس نے اویس کو اس فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ شاعر ہے۔ تاہم مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ شعر فہمی کا عمدہ مذاق رکھتا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن اُس نے لفافہ بند شعری بیاض میرے گھر بھیج دی کہ میں اس پر کچھ لکھ دوں۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ یہ سوچتے ہوئے بھاری بھرکم لفافہ کھولا کہ دو چار صفحے پلٹ کر ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اویس اپنی خوش فکری کو شاعری سمجھنے کے التباس کا شکار ہے۔ سو میں اُسے فون کر کے شائستگی سے بتا دوں گا کہ عزیزِ من! یہ بھاری پتھر تم سے اٹھنے کا نہیں۔ اسے یہیں چھوڑ کر معمولاتِ حیات کی طرف پلٹ جاؤ۔

لفافہ کھولا تو مجھے تین اجزاء پر مشتمل بیاض دکھائی دی۔ حمد و مناجات، نظمیں اور غزلیں۔

پہلے جزو کا پہلا ورق پلٹا تو حمد پر نظر پڑی:

بحر و بر کو سنبھالتا تو ہے
ہیرے موتی نکالتا تو ہے
مشرقوں سے ابھار کر سورج
ساری دنیا اجالتا تو ہے
جن کو میں خود بُلا کے لاتا ہوں
ان بلاؤں کو ٹالتا تو ہے

ایک نعت ہے:

فرشتوں کے پر ہیں مدینے کی گلیاں
وہ عرشی نگر ہیں مدینے کی گلیاں
سُو غم کی گرمی سے یوں جلنے والو
شجر ہی شجر ہیں مدینے کی گلیاں
سہاروں کی مجھ کو ضرورت نہیں ہے
کہ حدِ نظر ہیں مدینے کی گلیاں

میں صفحے پلٹتا، دیکھتا اور پڑھتا چلا گیا اور ساتھ ساتھ اپنی کج فکری کا ماتم بھی کرتا گیا۔ اویس تو اچھا خاصا شاعر ہے۔ شعری جمالیات کا فہم و ادراک رکھنے والا، دخترِ دہقاں کے گیت جیسا سادہ و پُرسوز۔

میری عمر کا بڑا حصہ شعر و ادب پڑھتے گذرا۔ کبھی جی چاہتا ہے شعر کی مشق بھی کر لیتا ہوں لیکن کسی کی شاعری پر ناقدانہ تبصرہ، میرے بس کی بات نہیں، نہ ہی اس کا 'محاورہ' ہے۔ بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اویس کی شاعری اچھی لگی۔ تصنع سے پاک، بے ساختہ اور رواں دواں۔ غزل ہو یا نظم، وہ ندرت

خیال کی تلاش میں ابہام کا شکار نہیں ہوتا۔ سادگی و پُرکاری کی حامل اس کی شاعری بہار کی لطیف ہوا اور سرما کی رومانوی بارش کی طرح دل و دماغ میں اترتی جاتی ہے۔ اس سادگی نے، اویس کے کلام کو ایک خاص بہاؤ اور رچاؤ عطا کیا ہے جو ہر اچھی شاعری کا جوہر ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کی نظم میں بھی غزل کی لطافتیں سمائی ہوئی ہیں۔ اردو غزل نے بڑی منزلیں طے کر لی ہیں۔ آج اس کا دامانِ کشادہ ہر نوع کے معاملات حتیٰ کہ عصری مسائل کو بھی سمیٹے ہوئے ہے لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ اویس کی غزل ہماری روایت سے جڑی ہے اور انہی جذبوں کی امین ہے جو صدیوں سے انسانی فطرت کا جزو لطیف ہیں۔

دور صحرا کی کڑی دھوپ میں چھاؤں جیسا
وہ تو لگتا تھا مجھے میری دعاؤں جیسا
اب اُسے ڈھونڈتا پھرتا ہوں بیابانوں میں
جو میرے پاس سے گزرا تھا ہواؤں جیسا

.....

تم سے ملنا تو خواب جیسا تھا
دل کا کھلنا گلاب جیسا تھا

.....

آسماں یا زمیں سے لے آؤ
کوئی ان سے کہیں سے لے آؤ

.....

فکرِ دنیا میں سر کھپا کر بھی
تیرے غم کا خیال رکھتا ہوں

.....

یہ تو مجھے اب پتہ چلا ہے کہ اویس، قریۂ شعر میں نو وارد نہیں۔ اس کا پہلا مجموعۂ کلام کوئی دس برس قبل "دل کے سنبھل جانے تک" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کا دل ابھی تک نہیں سنبھلا اور آتش فشاں دہک رہا ہے۔ اس کا دوسرا مجموعہ "پانی سے لگی آگ" کے عنوان سے آ رہا ہے۔ اگر اویس اسی جذب و شوق سے شعر کہتا رہا تو یقیناً اس کے کلام میں مزید نکھار آئے گا۔ عشق اور ریاضت ہی پختگی کی منزلوں تک لے جاتی ہے۔ کاملیت تو محض ایک خواب ہے۔ یہ خواب زندہ رہنا چاہیے اور آگ ٹھنڈی نہیں ہونی چاہیے۔

میں اویس کے لئے دعا گو ہوں اور دوسرے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر اسے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

نشان پر نشان لگ نہیں رہا

شاعرِ امروز

محمد عامر

شاہد ماکلی

محمد عامر دوسری دہائی کے شعری منظر نامے پر ابھرنے والے تازہ کار شاعر ہیں۔ چھوٹی بحر میں کہے گئے ان کے اشعار زیادہ تاثیریت کے حامل ہیں۔ ان کا طرزِ احساس پرفارمیٹو پیرائے کے زیادہ قریب ہے۔ ان کے شعری عناصر میں سب سے متاثر کن عنصر ان کی جدید حسیت دانی ہے۔ جدید حسیاتی اپروچ سے جڑا ہوا ان کا اظہاریہ نہ صرف دل پذیر ہے بلکہ اپنے تیکھے پن کے باعث قاری کے دل پر ایک گہرا محسوساتی نقش چھوڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ محمد عامر خوشاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذیل میں ان کے چند منتخب اشعار:

گھر کی وسعت سے آپ واقف ہیں
ہو گا تقسیم تو بچے گا کیا

عمر کا مسئلہ بجا صاحب
ویسے وحشت میں کم نہیں ہوں

اس نے دیکھا تو مجھے علم ہوا
کوئی مجھ سے بھی بُرا دیکھتا ہے

کچھ بھی ہونے کا مجھ کو ڈر کم ہے
شکر ہے، دور کی نظر کم ہے

سوچنے والے کا دماغ نہیں
دیکھنے والے کی نظر کم ہے

کوئی لے جائے تو وہاں رو لوں
جہاں دو چار آدمی خوش ہیں

جو ہیں شاعر وہ شعر کہتے رہیں
جو مچھیرے ہیں مچھلیاں پکڑیں

ہم ذرا گھر سے ہو کے آتے ہیں
آپ اتنے میں تتلیاں پکڑیں

کوئی چلتا نہیں تو مجھ کو کیا
میرے پیچھے غبار چل رہا ہے

جب ضرورت ہو تب نہیں آنا
میرے کمرے میں اب نہیں آنا

تیری ان سے بات کرائی جائے تو
ممکن ہے سب گونگے بولنے لگ جائیں

دیکھ لے، ہوں تو پرانا گاہک
سوچ لے، اتنی رعایت بھی نہیں

اب مجھے کچھ نہیں اچھا لگتا
کسی بچے کی شرارت بھی نہیں

دوبارہ مجھ سے ہو نہیں رہا ہے عشق
نشان پر نشان لگ نہیں رہا

☆☆☆☆☆

سورج گزر رہا ہے یہاں

شاعرِ امروز

احسن سلیمان

شاہد ماکلی

احسن سلیمان کے ہاں رسمیت کا رد معنوی سطح پر بھی ملتا ہے اور حسیاتی سطح پر بھی۔ اور یہ رجحان دوسری دہائی کے اکثر نوجوان شاعروں کا غالب رجحان ہے۔ احسن سلیمان کا خاص جوہر جو انھیں دوسروں سے کسی حد تک الگ کرتا ہے وہ تسلسل کے ساتھ ان کی دروں بینی کے نتیجے میں مرتب ہونے والا بلیغ اظہاریہ ہے۔ وہ اشیاء اور انفاس کے باطن میں جھانکتے ہیں؛ پرتوں کو ہٹاتے ہیں؛ آخری تہہ تک پہنچتے ہیں؛ حقیقت دریافت کرتے ہیں اور پھر اپنے اس تجرباتی عمل کو تجزیاتی ابلاغ کے ساتھ شعر کی صورت میں ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اُن کے اس جوہر کی بالیدگی ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ احسن سلیمان جیسے ہونہار تخلیق کار اگر اپنے حقیقی جوہر کا بروقت ادراک کر لیں اور اس کے نکھار کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دیں تو ان کی نقش بندی زیادہ یادگار اور جاذبِ نظر قرار پاتی ہے۔

احسن سلیمان۔ 28 مارچ 1998ء کو آزاد کشمیر کے قصبہ تتہ پانی میں پیدا ہوئے۔ انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ سائنسز مارگلہ میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ 2014ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ذیل میں ان کا نمونہء کلام:

ہمارے سامنے دوزانو بیٹھنے والے
تمہارے سامنے ہی آ کے شاہ بنتے ہیں

میں ایسی بستی سے آیا ہوں خواب اٹھائے ہوئے
جہاں امید کی پہلی کرن بھی آخری ہے

ہمارے خواب ان سے بھی بڑے ہیں
مگر یہ کون سمجھائے بڑوں کو

سمجھ نہیں رہا کوئی ہمارے دکھ
عجیب لوگ ہیں ہمارے شہر کے

جانے والے کو زیادہ نہیں دیکھا کرتے
آنے والے نے اگر پوچھ لیا، کون ہے وہ؟

پوچھتے ہیں کہ محبت کا بھی خمیازہ ہے؟
مجھ سے ملیے کہ مرا زخم ابھی تازہ ہے

یہ کیا کہ سب سے داد کے طالب ہو شاعرو!
یعنی کہ وہ بھی روئے جسے کوئی غم نہ ہو

وہ مسکرا کے جدائی کو ٹال سکتے تھے
بچھڑنے والے کوئی حل نکال سکتے تھے

کسی نے چاہا جو بے انتہا تو یاد آیا
کسی کے دل پہ بہت بے اثر رہا ہوں میں

ہم نہ پلٹیں گے کسی اور صدا پر احسن
ہاں مگر تو نے پکارا تو چلے آئیں گے

یہ ملا آپ کا گستاخ کہہ رہا ہے مجھے
حضور ایک شکایت درود پاک کے ساتھ

کسی بھی فیصلے پر متفق نہیں ہوئے ہم
پر اتفاق سے بچھڑے ہیں اتفاق کے ساتھ

میں دیکھ ہی نہیں سکا جاتے ہوئے اسے
گاڑی چلی اور آنکھ میں تنکا چلا گیا

سویرے آئنہ مجھ سے سوال کرنے لگا
او بھائی! کب سے تو اپنا خیال کرنے لگا؟

سبھی مسئلے حل طلب ہیں مگر بھوک پہلے ہے احسن
محبت تو انساں کا اپنا بنایا ہوا مسئلہ ہے

یعنی بچھڑ کے آپ نے بھی شاعری ہی کی؟
یعنی کہ آپ نے بھی نیا کچھ نہیں کیا

اس لیے بھی میں اسے دیر تلک دیکھتا ہوں
کون سا وہ بھی مجھے دیکھ رہا ہوتا ہے

بس اک نظر سے میں نظروں میں آ گیا ورنہ
نظر نظر، نظر انداز کر رہی تھی مجھے

بات یونہی نہیں بڑھائی گئی
بات ہونے لگی تھی آئی گئی

یہ کیا کہ ساری رات کٹے جاگتے ہوئے
اور پھر بس ایک شعر ہو اس میں بھی دم نہ ہو

آپ منافق لوگ مریں گے بستر پر
ہم تو احسن چوک میں مارے جائیں گے

وہ رو رہا ہے کہ مجھ پر بہت ہنسا تھا کبھی
میں ہنس رہا ہوں کہ میں رو نہیں سکا اس کو

جانے ہمارے گاؤں میں کیا واقعہ ہوا
سورج گزر رہا ہے یہاں سے بجھا ہوا

وہ بیل سوکھتی جاتی ہے اور پیڑوں سے
لپٹتی جاتی ہے شاید کوئی ہرا کر دے

میں اس کی آنکھیں نہیں پاؤں دیکھ سکتا تھا
کہ اتنا نیچا دکھایا تھا جانے والے نے

کسی نے خواب میں آ کر کہا میں جا رہا ہوں
ہم آنکھ ملتے ہوئے اٹھ کے ہاتھ ملنے لگے

جب ان کے باغ کے پیڑوں کے ہاتھ خالی ہوئے
گرا دیا گیا میرا شجر بھی پھلتا ہوا

☆☆☆☆☆

ڈر [انشائیہ]

اقبال خان یوسف زئی

بچے کا نام!

اُس نے بتایا۔ ابو ہریرہ

میں نے کہا_ خُوب!

کہنے لگا ہم پیار سے اِسے شاہ رخ کہتے ہیں۔

یہ تو آپ نے آسمان کو زمین بنا دیا۔

میری بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے یا

شاید وہ یہ بات سمجھ نہیں پایا

بولا_ یہ دونوں مسلمانوں کے نام ہیں۔

میں نے کہا۔ بہت خوب!

اُنھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی

نکلتی ہیں دعائیں اُن کے مُنہ سے ٹھُمریاں بن کر

.....

ایک چوک پر کپڑے کے بڑے بینر پر لکھا تھا۔

امریکن کُتّو! تم پر اللہ کی لعنت

اُسی چوک پر ایک بورڈ پر لکھا تھا۔

امریکن لائسیم سکول_ داخلہ جاری ہے۔

ڈنمارک کارٹونسٹ کے کارٹونوں پر احتجاج

کے دوران عشقِ رسولؐ میں ایک ہجوم

حرمتِ رسول پر آنچ نہ آنے اور سرتن سے

جُدا ہونے کے جملوں سے مزّین بڑے

بڑے کتبے اُٹھائے پُر جوش نعرے لگاتا ہوا

گزر رہا ہے۔ اُن سے آگے ٹائروں کے

جلانے سے فضا کالی دھواں بنی گزرنے والوں کو اپنے جیسا بنا رہی ہے۔ عاشقانِ رسول کے نعرے لگانے والے ہجوم کے سامنے کچھ زیادہ پُر جوش دکانوں کو لوٹنے کے لیے اُن کے شٹر توڑ رہے ہیں۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اپنے ہی شہر کا سینما، مارکیٹ، موٹر سائیکلوں، موٹر کاروں کو جلا رہے ہیں۔ کاروں میں سوار حواس باختہ، سہمے ہوئے ہجوم کے نرغے میں پھنسے ہوئے اپنے ہی مذہب کے ماننے والوں سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے ہیں:

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی
جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو
تیرے.....

رسول کریم نے جو کچھ فرمایا اپنے عمل رویے اور سلوک سے حرف بہ حرف درست کر کے دکھایا میرے اک دوست نے مجھ سے استفسار کیا۔

ہم رسولؐ کریم کے احکامات کی پیروی نہ کر کے کیا اُن کی شان میں گستاخی نہیں کر رہے؟

ایک اور دوست نے کہا اگر اُس دن (جمعہ) چھٹی نہ دی جاتی تو اسقدر لوٹ مار آتش زنی جیسے واقعات نہ ہوتے۔ ایک نے از راہ تاسف یہ بھی کہا کہ تمام اسلامی ممالک میں اس کی پُر زور مذمت کی گئی وہاں کے عوام نے بھی اس فعل پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا مگر اتھاون (58) لوگوں کو قتل کر کے نہیں، آتش زنی لوٹ مار کر کے نہیں ___ تو کیا ہم اُن سے زیادہ اسلامی ہیں؟

حلالہ جائز ہے مگر ملالہ کو گولی ماردی جاتی ہے

علم کی پیاس اور جنسی پیاس میں کیا چیز مشترک ہے؟

ڈراؤنے (ڈرون) حملے ایک طرف امریکن ویزہ ایک طرف۔ دوہری شہریت کے حامل زیادہ تر امریکن شہریت کے ساتھ ہیں۔ یہ سوچ کر دم بخود بھی تو ہونا ہے جو ٹھیک ہے وہ ٹھیک ہے (مفادات کے تحت) امریکن ایڈ پر تنقید کی جا سکتی ہے مگر تنقید کرنے والوں کو بھی تو کچھ چاہیے۔ سوچا جا سکتا ہے ہتھیار کیا اُن کی سرزمین پر اُگ رہے ہیں جہاں وہ نیٹو فوج سے برسرِ پیکار ہیں یا سہولت کے ساتھ یوں کہہ لیں نیٹو فوج کس کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ اگر نبرد آزما نہیں تو پھر وہ کس کے لیے ہے اور کیوں ہے؟

عجب تماشا ہے وہ ہمیں بچا رہے ہیں یا ساری دنیا کے امن کو ___

امن بھی جنگ کا محتاج ہے؟

اشفاق احمد صاحب (ادبی دانشور) کے ایک ریڈیو پروگرام 'تلقین شاہ' کا ایک کردار 'ہدایت اللہ' بھی تھا۔ ایک خاص موقع پر اشفاق احمد صاحب جو تلقین شاہ بنے ہوئے ہیں اُسے کہتے ہیں۔

ہدایت اللہ تیں (تُو) ترقی نہیں کرنی

ایک مشاعرہ میں بہت سے معروف غیر معروف شاعروں کا کلام جاری تھا کہ میر مجلسِ مشاعرہ نے ایک شاعر ہدایت اللہ اختر صاحب کو دعوتِ کلام دی۔ وہ اپنی غزل پڑھ رہے تھے جس میں جب یہ شعر پڑھا تھا:

ہم اپنے آپ سے بھی خود نباہ کر نہ سکے
زمانے بھر سے بھلا ہم نباہ کیا کرتے

.....

تو سامعین میں سے کسی نے برجستہ کہا۔

ہدایت اللہ تیں ترقی نہیں کرنی

سو ہم اللہ کی ہدایت پر تو چل نہیں رہے صرف نام پر گزارہ کر رہے ہیں دعاؤں پہ پل رہے ہیں عمل سے ہم ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر ہیں۔ 1442 سال سے ہم نے کوئی قابلِ ذکر ایجاد نہیں کی، جو انسان کے لیے آسانیاں پیدا کر سکتی۔ ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیس میل فی سیکنڈ روشنی کی رفتار ہے اُن کے سائنسدان اس رفتار کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں استعمال کر رہے ہیں ہم آنے جانے کے لیے دوسرے کو دھکا مار رہے ہیں اُس کا راستہ روک کر خود آگے جانا چاہتے ہیں تیز سے تیز تر۔ مگر جس جگہ جانا ہے وہاں پہنچتے دیر سے ہی ہیں وہ راستہ دیتے ہیں اور وقت پر پہنچتے ہیں پھر کہتے ہیں اے اللہ ہم پر رحم فرما۔ سوال کیا جا سکتا ہے ہم نے رحم والا کونسا کارنامہ کیا ہے؟

اس پہلو پر بھی سوچا جا سکتا ہے کہ اگر تمام مذاہب اور اس کے ماننے والے سوائے اسلام کے قابلِ نفرت، قابلِ مذمت بلکہ اکثریت کی رائے میں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ہیں تو پھر اسلام کے ماننے والے جاننے والے خواہ کتنا ہی کم کیوں نہ مانتے اور جانتے ہوں سب سے اعلیٰ سب سے برتر ہیں۔ کیا خدا ہیں؟

اب اسلام کے یہ ماننے والے رسالت مآبؐ کی شان میں کوئی گستاخ لفظ کوئی کلمہ کوئی جملہ اُنھیں نہ ماننے والوں کے سامان کی توڑ پھوڑ حتیٰ کہ اُن کے گھروں کو بھی نیست و نابود کر کے اپنی جانب سے گر خدمتِ اسلام کر رہے ہیں تو سوچا جا سکتا ہے کہ اُن کے ایمان کس قدر پختہ ہیں اُن کا عقیدہ کس اوجِ ثریا پر ہے اُن کے مسلک کی معراج کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اب اِس مقام پر

ایک سوال ذہن و فکر کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ تو پھر ہم کیوں تفریق اور تقسیم ہو رہے ہیں؟ جبکہ واضح طور پر حکم الٰہی ہے کہ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ نہ ڈالو''

اور اگر ہم یہ کہیں کہ گستاخی رسول ہمارے خون کو کھولا دیتی ہے یا ہماری رگوں میں بھیڑیئے کی جبلت بھر دیتی ہے تو اسلام کے یہ داعی رسولؐ کریم کے احکامات پر عمل نہ کرنے والوں کی صف میں کھڑے کیا گستاخی رسول کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ اور اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو اسلام کے ماننے والے ملک میں کیا مساجد میں دھماکے نہیں ہو رہے؟ نماز کی ادائیگی کے وقت پہرہ نہیں دیا جا رہا؟ اور نماز کے بعد کیا مسجدوں کو تالے نہیں لگائے جا رہے؟ سڑکوں پر گلیوں سکولوں چوراہوں حتیٰ کہ گھر کی دہلیزیں بھی کیا محفوظ اور مامون ہیں؟ تفریق اور تقسیم کا عمل کیوں بڑھتا جا رہا ہے؟ صرف اپنے آپ کو محفوظ بنانے کے عمل سے محلوں، گلیوں میں رکاوٹیں، آہنی گیٹ، بیریئرز، سکیورٹی گارڈ کی موجودگی کیا ''قوم'' کہلانے کے سزاوار ہے؟ جسے یہ بھی ناز ہو کہ وہ محمدؐ کے اُمتی ہیں۔

موٹر سائیکلوں سے لے کر لینڈ کروزر یا اور قیمتی گاڑیوں میں سفر کرنے والے سڑکوں، چوراہاؤں، گلیوں میں بے حسی کے مظاہروں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف ہیں یا وہ راستہ دے رہے ہیں نظم و ضبط سے چل رہے ہیں۔ کاندھے سے کاندھا جوڑ کر ایک قوم کی طرح۔ دینِ اسلام کے داعی بن کر۔

یہاں تو دیکھا یہ جا رہا ہے کہ شہریوں کو محفوظ بنانے والوں نے اپنے آپ کو محفوظ بنانے کے لیے سیمنٹ کے بلاکس کی دیواریں، بیریئرز اور پہرے دار آدمیوں کو مامور کیا ہوا ہے۔ خاص خاص مقام پر جدید ٹیکنالوجی سے مزین کیمرے واک تھرو گیٹ نصب ہیں۔ شہریوں کی بھلائی کے لیے سڑکوں پر چیک پوسٹ ہیں جہاں چاق و چوبند باوردی آدمی کھڑے کیے ہوئے ہیں جو رانگلوں سے رشسٹ لگائے ہر آنے جانے والے کی، نظروں کی نظروں میں تصویر بناتے ہیں۔ کون کھرا کون کھوٹا۔؟ اور ان کے پیچھے ٹریفک کی بے ہنگم دھکم پیل۔ دن کے ایک خاص وقت تک یہ اہتمام اور انتظام رہتا ہے پھر شاید یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ مفسدوں، دہشت گردوں کو اس پہرے کے اُٹھ جانے کی اطلاع نہیں ہو گی جبکہ ہمارے اردگرد شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو، جس کے پاس موبائل فون نہ ہو۔ چلئے

صاحب شہریوں کی تشویش بھی ختم اور صاحبانِ کار پرواز کی فکر بھی اس کے باوجود بھی اگر کہیں کوئی دہشت گرد، خودکش حملہ آور اپنا کام کر جائیں تو کیا کیا جا سکتا ہے؟ میری یہ بات سُن کر میرے اک دوست نے کہا:

جاگدے رہیا ساڈھے تے نہ رہناں

.....

میں نے غنیمت جانا اُس کی بات ہنسی میں اُڑا دوں کہ ہم اب تو ہنسنا بھی بھول گئے ہیں عام آدمی جو ٹھہرا اب اِس عام آدمی کو خواہ ٹریفک کا مسئلہ درپیش ہو یا سکول کے بچوں کو سکول اور سکول سے بچ بچا کر گزرنے میں اپنا وقت زیادہ استعمال کرنا پڑے اُن کی بلا سے کیونکہ ہر آدمی اور ہر صاحبِ اختیار ادارے کو اپنے آپ کو محفوظ بنانے کا حق حاصل ہے۔ محلے گلیوں میں آہنی گیٹ لگانے والوں کی طرح۔ اب خواہ ٹارگٹ کلنگ ہو رہی ہو یا صرف کلنگ یا مہنگائی کے مارں کی خودکشی۔ ''عاشقانِ رسول'' کا تو یہ مسئلہ نہیں بلکہ سرے سے یہ مسئلہ یہ نہیں، حکومت جانے اور حکومت کرنے والے جانیں۔ بے بس محکوموں کا کام تو بس حکم ماننا ٹھہرا۔ پستول کی نالی اُن کی طرف کرنے والا باوردی ہے یا وردی کے بغیر، مہنگائی کی توپ کے سامنے بھی وہ ہیں میزائل اور ڈرون حملے بھی اُنھیں محفوظ اور مامون بنانے کے لیے کیے جاتے ہیں اور کیے جا رہے ہیں۔

کارِ جہاں دراز ہے

مگر میری سوچ اُس ''تاتاری'' حملے پر سانس لینا بھی بھول گئی جو گستاخِ رسول کے انفرادی فعل پر اجتماعی طور پر عام آدمیوں پر مسلح حملہ کیا گیا ''سانحۂ بادامی باغ''۔ بدنامی داغ بنا معلوم نہیں۔ اس سے کس عقیدے اور مسلک کی خدمت کی گئی۔

میرا ہمزاد زچ ہو کر میرے سامنے کھڑا ہے، کیا آنے والے دن 'جہالت' میں پی ایچ ڈی کے ڈگری یافتہ کو ''ان پڑھ'' بنانے کا ذریعہ بن سکیں گے اور ان پڑھ کو اقرا یعنی تعلیم کا موجب ٹھہرائیں گے۔ انصاف سب کے لیے کا نعرہ اب محض نعرہ نہ رہے گا۔ امن کسی فرقے کی میراث نہ بنے گا اور اگر یہ سب کچھ ہو جائے رشوت کا جن بوتل میں بند ہو جائے۔ یعنی

امن ملے تیرے بچوں کو اور انصاف ملے
دودھ ملے چاندی جیسا پانی صاف ملے

.....

یہ سُن کر میرا ایک ہمزاد استہزایہ ہنسی ہنستا ہوا غائب ہو جاتا ہے کیونکہ ہم جیسے آدمیوں کا دارومدار اب دعاؤں پر رہ گیا ہے عملے سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔

☆☆☆☆☆

جمیل یوسف کی شاعری کا اوّلیں دور

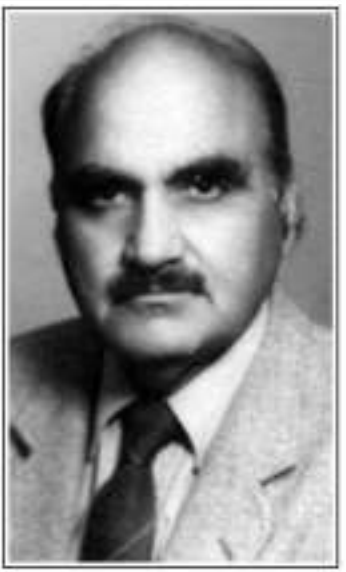

جمیل یوسف ہمارے وہ شاعر دلنواز ہیں جو گزشتہ نصف صدی سے اردو شاعری کو ثروت مند بنانے میں مصروف ہیں۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام ان کے زمانۂ طالب علمی کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل پہلی نظم 'دُعا' انھوں نے اس وقت کہی تھی جب وہ میٹرک کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں وطن ان کا محبوب تھا اور اقبال اور قائداعظم کا حسنِ فکر و عمل ان کے لیے سب سے زیادہ کشش انگیز تھا۔ زلف و رخسار کے سحر میں مبتلا ہونے سے برسوں پیشتر بانیانِ پاکستان اُن کے ہیرو اور پاکستان ان ان کا محبوب بن چکا تھا۔

ہمارے ہاں ترمیم پسندی اور آدرش فراموشی کے دور میں اُن کا یہ قومی طرزِ احساس حُسن صورت سے کہیں زیادہ حُسن عمل کا ثناخواں تھا۔ جمالیات سے کہیں زیادہ پاکستان پر ان کے دیدہ و دل نثار تھے۔ پھر یوں ہوا کہ برطانوی نژاد افسر شاہی نے ہم سے تحریکِ پاکستان کے قائدین کا جذب کامل، عزم راسخ اور حسنِ کردار چھین لیا۔ ایوب آمریت کے تسلط کے زیرِ اثر ترمیم پسندی اور آدرش فراموشی ہمارے ہاں سِکۂ رائج الوقت ہو کر رہ گئی تھی۔ ۱۹۵۸ اور ۱۹۷۱ کے سانحات پر ان کی نظموں میں ہمارے قومی زوال کو بڑی دلسوزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس دور کی غزلیات میں بھی پاکستان ہی حقیقت ہے اور پاکستان ہی مجاز۔ ہمارا شاعر نام نہاد رہبروں کی رہزنی کو نت نئے انداز میں بے نقاب کرنے لگتا ہے:

گرفتِ شب میں وہ گم سُم نگر ہمارے ہوئے
کہ تیرگی میں نہاں بام و در ہمارے ہوئے
گھروں پہ ٹوٹ پڑے تھے گھروں کے رکھوالے
نہ پوچھ کس طرح برباد گھر ہمارے ہوئے

فتح محمد ملک

جو باغبان تھے، مٹی میں زہر بھرنے لگے
اسی لیے تو شجر بے ثمر ہمارے ہوئے
رقیب تھے جو ہمارے طبیب بن بیٹھے
جو حیلہ جو تھے وہ سب چارہ گر ہمارے ہوئے

قیام پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگانے والی سامراجی انجنیاں صدر ایوب کی رہبر و رہنما بن گئیں۔ نتیجہ یہ کہ:

نہ راستہ ہے نہ منزل نہ کارواں والے
بس ایک گرد رہ کارواں دکھائی دے
یہ کیا کہ عالم امکاں میں جس طرف جاؤں
فقط بکھرتی رتوں کا سماں دکھائی دے

☆

یہ ہے آئینِ چمن بندی کے ہیں
خار و خس، گل سے ہوا آراستہ
اے وطن میں نے تیری تصویر کو
اشکِ خوں سے کر دیا آراستہ

☆

مری زمیں کسی سورج کے انتظار میں ہے
تمام عالمِ امکاں ابھی غبار میں ہے

.....

تہ بہ تہ اندھیروں کے اس عالم میں جمیل یوسف کو اقبال اور قائداعظم کی یاد ستانے لگتی ہے جن کے شعلۂ نور سے تاریکیاں چھٹ گئی تھیں اور ایک عوامی جمہوری تحریک، پاکستان کو عدم سے وجود میں لے آئی تھی۔ بعد ازاں صدر ایوب نے اُس تصور کو پاکستان کے وجود سے نکال باہر کیا۔ نتیجہ یہ کہ جمیل یوسف کو تصور پاکستان رہ رہ کے یاد آنے لگا۔ یوں وہ اقبال اور قائداعظم کی حریتِ فکر و عمل کی دولتِ نایاب کی تلاش و جستجو میں سرگرم فغاں ہو گئے:

وہی جو ٹھہری ہے ظلمت کی سازشوں کا ہدف
وہ اک کرن جو تیری حرفِ لا الٰہ میں ہے
کبھی تھا جس کو ترا شعلۂ نوا قندیل
وہ قافلہ ابھی دشتِ شبِ سیاہ میں ہے
(اقبال)

قائداعظم نے اقبال کے شعلۂ نوا کی روشنی میں تحریکِ پاکستان کو یوں سمت و رفتار عطا کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے:

بکھرے ہوئے بھٹکے ہوئے لوگوں کو
اک وحدت بنا ڈالا
مسلمانوں کو اک ملت بنا ڈالا
وہ اب بھی قوم کے سینے میں دل بن کر دھڑکتا ہے
ہماری آرزوؤں میں وہ ابھی رنگ بھرتا ہے
وہ فردوس بریں سے آج بھی
ارض وطن پر
روشنی بن کر اُترتا ہے .....
(قائداعظم)

جمیل یوسف لڑکپن ہی سے اپنی شاعری میں قومی جذب و جنوں کی ترجمانی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ عشق بتاں میں بعد میں مبتلا ہوئے اور عشقِ پاکستان سے سرشار ہوئے۔ وہ آج بھی پاکستان کی گم شدہ نظریاتی اساس کی بازیافت کی تمنا میں سرگرم تخلیق ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

☆☆☆☆☆

شناخت

وقفے وقفے سے آواز ہ اُٹھتا ہے..... ''بہت ہو چکی شاعری اور اَب مصلّی اُٹھایئے''..... مگر یہ کم بخت ایسی سخت جاں ہے کہ مرتے مرتے جی اُٹھتی ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے آغاز بہاول پور کے ایک مقامی اخبار میں یہ خبر چھپی کہ بہت سے شاعر شاعری سے تائب ہو گئے ہیں۔ کئی نام سامنے آئے' وہ لوگ توبہ پر قائم رہے یا نہیں' اَب یاد نہیں۔ میں سائنس کا طالب علم تھا اَور اِدھر سے میرا گزر بڑی حد تک سننے کی حد تک تھا، مگر قافیہ پیمائی کی سخت جانی دیکھیے کہ ہزاروں نئے لوگ اس دوڑ میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اِدھر آنے کی وجہ کئی بار بتا چکا ہوں ۔ پھر آ گیا تو آ گیا۔ گھنگرو باندھ لیے تو ناچنے سے کیا شرمانا! متحدہ عرب امارات کے قیام کے اواخر میں شعری مجموعہ ''اُڑانوں کا ہرا موسم'' شائع ہو گیا۔2009ء میں وطن واپسی ہوئی تو یہ بات سامنے آئی کہ بہت سامال تو ابھی الگ پڑا ہے۔ لشٹم پشٹم دوسرا مجموعہ ''رخت'' مرتب ہو گیا۔ اِس اَثنا میں دوستوں کی اُشکل اور ''بیاض'' کی مشکل سے تیسرا مجموعہ ''چاک'' چھاپ دیا۔ جو خالد احمد ایوارڈ کے لیے منتخب ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بقول نجیب احمد (مرحوم) شامل ایک غزل کے ایک مصرعے کی ''ی'' گر گئی تھی۔ (مرحوم) شفیق سلیمی کے مطابق ''یار میں نے اپنے نام کے ساتھ 'ی' بھی لگائی ہے مگر کٹڑ اہلِ زبان بھی خوش نہیں ہوئے''.....اور اپنی عادت لاپروائی کی۔ رفیق اظہر (مرحوم) کے ''رخت'' کے دیباچے میں لکھا۔

اسلام عظمی نے مجھے اپنے اشعار کا ایک مسودہ دیا ''ایک نظر دیکھ لو'' میں نے کہا اگر مجھے کچھ اشعار یا غزلیں پسند نہ آئیں تو؟ اسلام عظمی کہنے لگا ''نکال دیں گے۔'' میں حیران رہ گیا کہ میں تو اپنے شعر کا ایک لفظ بھی کاٹنے کا روادار نہیں ہوتا اسلام عظمی عجیب شخص ہے اختیار دیتا ہے

اسلام عظمی

کہ جو جو کانٹا ہے کاٹ دو - مزید
استفسار پر کہنے لگا اور کہہ لیں گے گویا:
؎ جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

.....

اپنے تیسرے شعری مجموعے "چاک" کے بعد میں نے نثر پر توجہ دینے کا ارادہ کر لیا' پھر بھی اتنی غزلیں جمع ہو گئیں کہ "ناتراش" ترتیب دے سکوں۔ "ناتراش" کو بہر حال آپ کو بھگتنا پڑے گا۔ ویسے یہ بھی میرا حسنِ ظن ہے۔ اپنے پہلے شعری مجموعہ کے دیباچے میں لکھا تھا کہ اسلام عظمی تمھیں کسی نے شعر کہنے کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔ اِس لیے تم کسی کو اپنی شاعری پڑھنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ تو من کا سودا ہے۔ ہر بندہ سواد اور با معنی مواد پر یقین نہیں رکھتا۔ شعر گوئی اور شعر فہمی دونوں خداداد ہیں۔ اعتراف کی نعمت ہر کسی کو عطا نہیں ہوتی۔ پھر بھی خواہش تو نہیں مرتی۔ پچھلے دنوں اخبار جنگ میں ایک خط سعادت حسن منٹو بنام مجید امجد چھپا۔

امجد صاحب

السلام علیکم۔ آج آپ کو ایک تکلیف دے رہا ہوں۔ فوراً قلم اُٹھایئے اور نظم یا نثر میں میرے متعلق جو Inspiration آپ کے دماغ میں آئیں' کاغذ پر منتقل کر دیجیے۔ یہ فوری طور پر ہونا چاہیے۔ میں ایک عجیب و غریب چیز مرتب کر رہا ہوں جس کا نام "ناخن کا قرض" ہے۔ اِس کلا اوّل تا آخر منٹو سے متعلق ہے۔ میں واپسی ڈاک میں آپ کے Inspiration کا منتظر رہوں گا۔ باقی باتیں پھر۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

.....

یہ سطریں پڑھتے ہی ذہن میں ایک خیال آیا اور چند سطریں لکھ کر فیس بک پر ڈال دیں۔

آج کے اخبار جنگ میں سعادت حسن منٹو کا ایک خط چھپا ہے' جس میں اُنھوں نے مجید امجد سے اپنی کتاب کے بارے میں مضمون کی فرمائش کی ہے۔ میرا چوتھا شعری مجموعہ آ رہا ہے "ناتراش"..... نہ تو میں سعادت حسن منٹو ہوں اور نہ ہی آپ مجید امجد ہیں۔ (پھر بھی) دنیا کے (کم و بیش) ہر خطے میں ہر لکھنے والے تک میری کوئی نہ کوئی کتاب ضرور پہنچی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ تک بھی میری کوئی نہ کوئی کتاب پہنچ چکی ہوگی۔ قلم ہاتھ میں ہے تو (دیر کس بات کی) "ناتراش" کے لیے (حسبِ توفیق) چند سطریں لکھ ڈالیں یا چند الفاظ۔ بھاری پتھر ہے تو چومے بغیر چھوڑ دیجیے.....

بہت سے کام بندہ ایسے ہی کر ڈالتا ہے۔ یہ سطور غالباً مارچ ۲۰۲۱ میں لکھیں اور انھیں سپردِ فیس بک کر کے بھول گیا چند روز بعد ظفر سپل کا

فون آیا۔ اُنھوں نے چند سطریں لکھ کر فیس بک پر ڈال دی تھیں۔ آپ بھی دیکھ لیجیے۔

زندگی کا بیشتر حصہ خلیجی ممالک میں گزارنے والے سینئر قلمکار اسلام عظمی کا تعلق لاہور سے ہے۔ میری اُن سے ملاقات تو نہیں ہے مگر جب اُنھوں نے 'فنون' میں پندرہ سال قبل چھپنے والے افسانہ ''سراقہ کے کنگن'' کا محبت بھرا تذکرہ کیا تو ظاہر ہے کہ خوشی ہوئی۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی ہے' ناول نگار بھی' شاعر بھی اور مضمون نگار بھی۔ ادبی مضامین پر مبنی اس کی کتاب ''ساختہ'' موجودگان اور رفتگان کی شخصیت اور اُن کی کتابوں کے نہایت عمدہ تجزیوں پر مبنی ہے۔ اس کی نثر خوبصورت ہے اور بظاہر بھلے مانس دکھائی دینے والا آدمی چبھتا ہوا فقرہ لکھنے کا فن جانتا ہے۔ اس کی ایک مختلف قسم کی کتاب ''آؤٹ سائیڈر'' کے نام موجود ہے جس میں اُس نے غیر مربوط یادداشتیں رقم کی ہیں' زیادہ تر پیشہ وارانہ زندگی کے متعلق..... لیکن جہاں کہیں ادبی تذکرے آتے ہیں یا پھر لاہور کا ذکر' وہ مقامات دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ شاعری کی کتاب ''چاک'' کے ایک شعر نے میری توجہ کھینچی۔

تو کس طرح فریبِ محبت میں آ گیا
مجھ کو تو خیر روکنے والا کوئی نہ تھا

میں نہیں جانتا کہ مجید امجد نے منٹو کے خط کے جواب میں کیا لکھا۔ آپس کی بات یہ ہے کہ 'سویر' کسی کے مرغے کی بانگ (اذان) کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ قدرت کا اپنا نظام ہے اور اس کے مطابق دنیا چلتی رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ پھر ہوا یوں کہ راجا نیر سے اس بات کا تذکرہ کر بیٹھا۔ وہ بھی پکا پٹھا نہیں۔ پوچھنے لگا کہ پیش لفظ کون لکھ رہا ہے؟ بتایا کہ سوال کی عادت نہیں۔ وطن واپسی کے بعد سے وہ میرے نئے دوستوں سے ہے۔ دوستوں کی صف میں شامل ہونے کے بعد اُس نے درجنوں لکھاریوں سے مجھے متعارف کرایا۔

'' یہ کیا بات ہوئی؟''..... راجا نیر نے کہا اور ''ناتراش'' کا مسودہ جو پروف ریڈنگ کے لیے اُس کے پاس تھا' لے کر جناب خواجہ زکریا اور جناب جمیل احمد عدیل کے پاس جا پہنچا۔ دونوں کا بہت شکریہ۔ میں اُن کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے جو مناسب سمجھا لکھ دیا۔ جس طرح لکھا گیا اُسی طرح چھپ رہا ہے۔

کبھی دیہاتی لوگ ڈاکٹروں سے بہت ڈرتے کہ وہ سوئی' چبھو دیتے ہیں۔ الحمدللہ..... کرونا نے یہ ڈر ختم کر دیا ہے۔ ڈر کے ختم ہونے میں پیار کا بہت عمل دخل ہے جبھی..... گانا ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا''..... ہٹ ہو گیا تھا۔ زندگی بہت پیاری چیز ہے۔ اس کے ڈر نے سوئی چبھنے کا ڈر بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

اللہ رب العزت آپ کے ذوقِ مطالعہ میں برکت ڈالے۔ آمین.....

☆☆☆☆☆

تم بھی علامت ہو (اعزاز یافتہ شاعر جاہد الحق اور اس کی بنگلہ نظمیں)

تم بھی تو تصویر میں شامل اک تصویر ہی تھیں
اک کھلتی تصویر
سینے میں در وا کرتی اک روشن سی تصویر---
---دیکھو نا، ارے دیکھو نا!
کیا تمہیں یہ تصویر دکھائی دیتی ہے؟
ابھی ابھی مری آنکھیں تم کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ (تصویر)

.....

''ریڈی !--- سمائل---!''
کلک--- کلک--- کلک۔
''لیجیے، اپنا کیمرہ۔ تین تصویریں لی ہیں۔ ایک تو اچھی آ ہی جائے گی۔''
ریڈیو ڈوچے ویلے (دی وائس آف جرمنی) کولون کی رُکن اور جرمنی میں ہمارے اوّلین پیشہ ورانہ سفر کی میزبان فرانسیسی نژاد خاتون رینے شوالر نے شہر بون کے نزدیک واقع قصبہ باڈ ہونف کے علاقہ روئن ڈورف میں ایستادہ تاریخی میوزیم ''آڈے ناور ہاؤس'' کی پختہ بیرونی سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے آٹو فوکس نائیکون کیمرہ مجھے لوٹاتے ہوئے اور دل کش انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وسط فروری کے ابر آلود سلیٹی سے یورپی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی:
''لگتا ہے، بارش پھر سے شروع ہونے والی ہے۔ کیوں نہ ہم اس کو شکست دے دیں اور اس سے پہلے ہی وفاقی پارلیمان کی عمارت کی سیر بھی کر لیں! راستے میں کافی بھی پی لیں گے۔ میں شہر بون میں ایک اچھے کیفے کا پتہ جانتی ہوں--- کیا خیال ہے؟ تو آیئے، جلدی سے بس کی طرف قدم بڑھاتے ہیں--- یہ رستہ ڈھلوانی

حامد یزدانی

ہے، احتیاط سے، ذرا سنبھل کر۔"
بین الاقوامی جرمن نشریاتی ادارے میں اردو، ہندی، بنگالی، انڈونیشیائی اور جانے کس کس زبان کے نو وارد ہم آٹھ پروڈیوسر خواتین و حضرات خاموشی سے، اپنی جیکٹیں اور کوٹ سنبھالتے ہوئے، نیچے سبزے میں گھری ابھری سڑک کے کنارے کھڑی سہ رنگ سیاحی بس کی طرف لپکتی رینے کے پیچھے پیچھے نیچے اترنے لگے جس نے ہمارے جواب یا رائے کا انتظار کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

آج ایک مدت بعد جرمنی میں لئے گئے اس گروپ فوٹو کو دیکھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے تو میں واقعی کینیڈا سے غیر حاضر ہو گیا تھا۔ برسوں پہلے کے اس منجمد لمحے نے رخشِ یاد کو جانے کن وادیوں کی طرف دھکیل دیا تھا! دریائے رائن کے پہلو میں بچھے انگور کے باغات، طلسماتی کہانیوں سے آئے تاریخی محلات، کولون سے بون، بروہل، ریلنز، فرینکفرٹ، ڈوسل ڈورف، ڈوپرٹال، برلن اور لائپ سِش --- اور پھر یورپ کے زمینی، فضائی اور آبی راستے عبور کرتی آوارہ گردی جو ایمسٹرڈم، روٹرڈم، دی ہیگ، برسلز، لندن اور --- اور --- کہاں کہاں گھماتی پھر سے واپس کولون لے آتی مہربان دوست امجد علی کے پاس، اعجاز شاہ صاحب، ناز بہن اور ممی کے پاس جن کے ہاں دن ختم ہوتے ہی مہمان نوازی کی فراخ دل روایت کا آغاز ہو جاتا تھا۔ یہاں آبائی وطن سے دور احباب کو خوش دلی سے جمع دیکھ کر بار بار جناب یزدانی جالندھری کا یہ شعر ذہن میں گونج اٹھتا:

غنیمت ہے جو کچھ لمحے کو چند احباب مل بیٹھیں
وگرنہ اس زمانے میں میسر ہے کہاں یہ بھی

....

مجھے یاد ہے ناز بہن اور شاہ صاحب کے ہاں، ایسی ہی ایک نکھری مہمان نواز محفل میں دل کش، مہکتی بہار یہ شام کے جلو میں ایک پُرکشش، سانولے بنگالی نوجوان سے تعارف ہوا۔ اُس نے مجھے نہ پہچانا مگر میری یادداشت میں جگمگاتے باڈ ہونف کے گروپ فوٹو میں اس نوجوان کی صورت بہت واضح تھی۔ میں نے ازراہِ تعارف ہاتھ آگے بڑھایا:

"حامد --- حامد یزدانی"

'انتقاماً' اُس نے بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا:

"جاہد --- جاہد الحق"۔

اتنے میں ہماری رسمی مسکراہٹوں کے تبادلے میں اپنے دلآویز تبسم کو شامل کرتے ہوئے میزبان شاہ صاحب آگئے۔ شوخ لہجے میں بولے:

''بھئی واہ! دو شاعر ایک ساتھ اور وہ بھی مسکراتے ہوئے۔۔۔ اللہ خیر کرے۔''

لفظ ''شاعر'' سنتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے ہمارے ہاتھوں کی رسمی گرفت میں جذبے کی حرارت بھی آن شامل ہوئی ہو، مسکراہٹیں قدرے گہری ہوگئی ہوں اور آنکھوں میں خوش گوار سا استقبالی استعجاب کھیلنے لگا ہو۔

دعوت سے واپسی پر ہم ایک دوسرے کے ہم۔راہ ہو لیے۔ رات کے گہرے آسمان پر پورا چاند جگمگا رہا تھا۔ چلتے چلتے میں یہ جان گیا کہ سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے ادب خیز علاقے کومیلا میں آنکھ کھولنے والے جاہدالحق کا تعلق ایک تعلیم یافتہ معزز گھرانے سے ہے، اس کے والد ڈاکٹر تھے۔ اس کی عملی زندگی کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ریڈیو پاکستان میں ملازمت سے ہوا تھا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ ریڈیو بنگلہ دیش سے منسلک ہوگیا۔ اندرونِ ملک خدمات انجام دینے کے بعد اب وہ کچھ سال کے لیے ریڈیو ڈوچے ویلے (دی واکس آف جرمنی) کولون کی بنگلہ نشریات میں تعینات ہوا تھا۔ اور یہ کہ اس کی شاعری کے چار پانچ مجموعے بھی اشاعت پزیر ہو چکے۔ اس کی کچھ بنگلہ نظموں کے انگریزی زبان میں تراجم بھی ہوئے۔ دنیا بھر کے کلاسیکی اور جدید اردو شعرا کے جلو میں وہ میں وہ غالب، اقبال اور فیض کا بھی گرویدہ تھا۔ وہ یہ بتا رہا تھا اور 'سول شناک' کی طرف جاتی ایک خالی ٹرام یک دم ہمارے پاس سے گزر گئی۔ جاہد کو جانے کس شب کی کہانی یاد آ گئی تھی:

گہری شب کی یہ خالی ٹرام
اس میں ہی بیٹھ کر ان محلوں سے ہوتے ہوئے
بہتے رائن کو چھوتے ہوئے
دونوں ہم
چاند کے۔۔۔
پورے اس چاند کے پاس جائیں (پورے چاند کے انتظار میں)
اس سے پہلے کہ اس کی نظم مکمل ہوتی 'بروہلر شٹراسے' اور 'راڈربرگ گورٹل' کا چوراہا آ گیا جہاں سے ہمارے راستے جدا ہونا تھے۔۔ تاکہ پھر مل سکیں اور مسلسل مل سکیں:

کیا میں پھر آؤں گا، ان بہاروں میں؟
جب پتے جھڑنے لگیں گے
حُسنِ فطرت کی رنگیں کتابوں میں
جب زرد پتوں کی اک بھیڑ ہوگی
تو پھر ہم ملیں گے
ہاں، ملیں گے کئی بار۔۔۔ ہم۔ (برول)

.....

یہ واقعی ہماری خوش قسمتی تھی کہ زرد پتے گرنے کے موسم کی آمد سے پہلے پہلے ہی ہمیں ملنے کے کتنے ہی مواقع میسر آ گئے۔ ملاقاتیں ہوئیں، باتیں ہوئیں اور متواتر ہوئیں۔ پھر یوں ہوا کہ ہم عالمی فنون و ادبیات پر باتیں کرتے کرتے اپنی شاعری بھی ایک دوسرے کو سنانے لگے۔ سمجھنے کے لیے اردو سے بنگالی سے انگریزی --انگریزی سے بنگالی سے اردو--- وغیرہ وغیرہ--- جو بھی وسیلہ کارآمد ہوتا استعمال کر لیتے۔ چائے، کافی پیتے، امجد کے لائے ہوئے جرمن شارٹ کیک بسکٹ اور طاہرہ کے بنائے گہرے بھورے گلاب جامن اُڑاتے ہوئے شعر و ادب کی راہ داریوں میں گم رہتے۔

یورپ آتے ہوئے جاہد الحق ڈھاکہ سے اپنے اہلِ خانہ کو ساتھ نہ لایا تھا۔ گویا بظاہر اکیلا آیا تھا۔ وہ کوملا سے ڈھاکہ تک پھیلے مکالماتی راستے، شام شام حسن سمیٹتے پرسکون تالاب، راہ تکتی اونچی نیچی عمارتیں، آنکھیں جھپکتی، دھیمی دھیمی لیمپ پوسٹ اور اپنے شب زدہ لکھاری دوست وہیں چھوڑ آیا تھا مگر حیرت یہ کہ وہ پھر بھی اکیلا نہ تھا۔ اور کوئی ہو نہ ہو، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس مسافت میں اُس کی محبت بہرصورت اس کے ہمراہ تھی۔

غالباً اس کی پہلی محبت یعنی شاعری۔

اس کی شاعری پڑھتے اور سنتے ہوئے مجھے لگتا کہ جاہد الحق بظاہر فانی لفظوں سے لافانی محبت تخلیق کرنے والا شاعر ہے۔ اور اس محبت کا دوسرا یا شاید پہلا نام ''شاعری'' ہے جس کے بے کنار حُسن کو وہ سطر سطر بُنا کرتا ہے:

جب میں تمہیں بُنتا ہوں لفظوں کی بافت میں، بیل بوٹوں میں
یا تخیل خواب میں
تو مجھے تمہارا اَن دیا دکھائی دیتا ہے
اُڑتا ہوا، بے کنار بادلوں میں۔ (رومال)

ان اُڑتے ہوئے، دل کش اور پراسرار بادلوں ہی کے پار کہیں دُور، محبت کے ایک عالمگیر جذبے کی بنیادوں پر، اُس نے اپنے تخیل کی ایک کثیر قومی بستی بسا رکھی ہے جس کی حدود کہیں تو تاریخِ فن کی قدیم ترین دیواروں کو چھوتی ہیں اور کہیں ان جانے خواب فردا کے سفر کی بے کرانیوں سے مصافحہ کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ اپنے وطن، مادری زبان اور قدرت کے بخشے رشتوں کی قدر کرتے ہوئے وہ اُس بین الاقوامیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا جو لہو کی صورت اس کے تخلیقی وجود کے رگ و پے میں رواں

دواں ہے۔اس کی تخیلی بستی میں وقت، زبان اور قومیت کے امتیاز سے بے نیاز دنیا بھر کے فن کار سمائے ہوئے ہیں؛ ماضی کے بھی اور حال کے بھی، مشرق سے بھی اور مغرب سے بھی۔ یہاں کہیں آپ کو بودلیر استراحت کرتا مل جائے گا اور کہیں سارتر اضطراب میں ڈوبا ہوا، اِدھر موپساں افسانہ طراز ہے اور اُدھر قاضی نذرالاسلام ڈھلتی رات کے ''روزن'' میں ''نغمۂ شباب'' کی ''باغی'' سطریں گنگنا رہا ہے۔۔ کسی بل کھاتی نظم کے ترچھے موڑ پر آپ کی مڈبھیڑ جوڑاشاکو سے آتے رابندرناتھ ٹیگور سے ہوجائے گی اور کسی پُر بہار باغ کی سیر کرتے ہوئے آپ اچانک سیالکوٹ کے علامہ اقبال سے ٹکرا جائیں گے جو جاوید کی آمد سے کوئی اسّی برس پہلے جرمنی کے ساتھ جذباتی اور ادبی رشتہ استوار کر چکا تھا۔ جیسے جاویدالحق کولون میں دریائے رائن کی لہروں پر نظمیں اچھال رہا تھا ویسے ہی اقبال ہائیڈل برگ میں دریائے نیکر کی ساحلی ہواؤں سے مخاطب رہا تھا۔اس کی نظم ''ایک شام'' (دریائے نیکر، ہائیڈل برگ کے کنارے پر) آج بھی وہاں کندہ ہے۔ 'اقبال اُوفر' نامی سڑک آپ ہائیڈل برگ کے کاغذی نقشے پر بھی بآسانی تلاش کر سکتے ہیں لیکن جاویدالحق کی تخیلی بستی میں سفر کے لیے آپ کو احساس کے نقشے کی ضرورت ہوگی کہ راستے سب کے سب خوابوں سے بنے ہیں جن پر بس آنسو ہیں کہ نشانِ منزل ٹھہرتے ہیں اور آنسوؤں کی زبان یکساں ہوتی ہے، بہائے وہ کسی بھی زمانے میں گئے ہوں، کسی بھی خطے میں، کسی کی بھی آنکھوں سے:

اگر تیری تسکین، تیری تسلی
غموں کا مداوا ٹھہرتی تو اے پیاری روشن سی لڑکی!
اِدھر جوڑاشا کو
اُدھر دُور افتادہ اک سیالکوٹ
ایسے آنسو بہاتے بھلا؟ (کیا میں بودلیر کی طرح)

بہت دل چسپ ہے اس کی یہ بستی جس میں کرۂ ارض کے کتنے ہی اہم ثقافتی مراکز تمثیل در تمثیل چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں پیرس ہے تو وہاں ڈھاکا، اِدھر کولون ہے تو اُدھر روم۔ اِس طرف برلن ہے تو اُس طرف ایمسٹرڈم۔ ابھی کوئی برسلز کے افق پر طلوع ہوتی صبح سے مخاطب تھا:

اے برسلز!
تمھیں یاد ہے وہ گھڑی؟
جب میں نکلا تھا کولون سے
ڈھونڈنے کو اُسے (اُس کی تلاش میں)

اور ابھی پیرس کی گلیوں میں، شاں زے لیزے کے شب رنگ پہلو میں مدھ بھری چاندنی کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے:

کل شب
شاں زے لیزے جیسے بہا جا رہا تھا
چاندنی میں
غوطیں کے کھینچے کسی دائرے کی طرح
ایک روشن چاند روشنی اگل رہا تھا
اور مجھے اکسا کر سارے پیرس میں
پھیلائے جا رہا تھا (شاں زے لیزے میں
پورا چاند)

.....

جاہد کی یہ تخیلی بستی وقت کی قیود سے بھی آزاد ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل تینوں رُتیں موسمِ امکان کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے باہم لہراتے ہوئے ملتی ہیں۔ حیرت ہے کہ یہاں کوئی بھی فن کار اجنبی محسوس نہیں ہوتا۔ سبھی ہم۔ عصر اور شناسا لگتے ہیں۔ جاہد کے تو گویا وہ گہرے دوست ہیں۔ وہ جب چاہے ان سے مل سکتا ہے۔ بات کر سکتا ہے حتیٰ کہ شہرِ خموشاں میں بھی وہ کوئی نوحہ پڑھنے نہیں بلکہ ان سے مکالمہ کرنے جاتا ہے یا شاید پہلے سے جاری کوئی مکالمہ مکمل کرنے، انہیں شاعری سنانے، ان کی خیریت دریافت کرنے:

مونپارناس گورستان میں
مرکزی دروازے سے داخل ہو کر
سارتر کو دائیں جانب چھوڑتے ہوئے
اور موپساں کو ذرا سا اور آگے
میں سیدھا تمہاری قبر پر پہنچا ہوں۔
کہو، کیسے ہو؟ (بودلیر کی قبر پر)

.....

عہد در عہد اور سفر در سفر کشید کی گئی زندگی کی گونا گونی، دنیا کی رنگا رنگی اور تخلیقی زبان کے موثر استعمال کا گہرا شعور یہ سب مل کر جاہد الحق کی نظموں کو ایمائیت کا ایک ایسا لازوال حُسن عطا کرتے ہیں جس کی کشش عصری شعری منظر نامے ہی کو نہیں بلکہ فردا کے امکانی خاکوں کو بھی مسحور کیے دیتی ہے۔ رات، چاند، ستارے، آنکھیں، سفر اور گھر اس کے محبوب استعارے ہیں۔ وہ قدیم جذبات اور مشاہدات کا اظہار کرتے ہوئے بھی جدید تر زندگی کی علامتوں اور کنایوں کو بے جھجک استعمال کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ پانی کا تیز بہاؤ دریا کے پتھریلے کناروں کو بھی کاٹ دینے کی قوت رکھتا ہے مگر، وہ سوچتا ہے، اس کی آنکھیں تو پتھر نہیں ہے وہ کیونکر گھلتی گاتی ہیں؛ بہتی جاتی ہیں کسی کے تعاقب میں:

میری آنکھیں پتھر تو نہیں ہیں

پھر یہ کیوں گھلتی جاتی ہیں، پتہ نہیں
کبھی کبھی چشموں کی صورت
تیرے تعاقب میں بہنے لگ جاتی
ہیں۔ (گیت)

....

ان گھلتی جاتی آنکھوں کے بچاؤ کے لیے ایک روز وہ کہیں سے ایک عجیب فریج تلاش کر لیتا ہے۔ نیلا ریفریجریٹر یعنی نیند:

نیند ایک نیلا ریفریجریٹر ہے
اگر یوں نہ ہوتا تو آنکھیں کبھی کی گل سڑ چکی ہوتیں
اس لیے میں بھی اپنی آنکھیں فریج کے اندر
ستاروں کے بھیگے سائے میں رکھتا ہوں
جب تمام راتیں ایک رات میں سما جائیں
جب پالیں آنکھیں اپنی پناہ گاہ
اپنا گھر --- (نیند)

جاہد کی طبیعت میں رواں دواں فنکارانہ بے چینی اور اضطراب اسے کہیں ٹکنے نہ دیتے تھے نہ ظاہری طور پر اور نہ ہی باطنی طور پر۔ وہ ہر دم ایک تازہ سفر کے لیے پر تولتا رہتا۔ جناب احمد مشتاق کا مصرعہ "یار سب جمع ہوئے رات کی خاموشی میں" گنگناتے ہوئے نئی صدی کی انگڑائی کے آس پاس یعنی نوے کی دہائی میں جب ہم اتفاقاً یورپ میں اکٹھا ہوئے تو جاہد الحق ہم میں سے کسی کو بھی ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ ہر دم سفر آمادہ، جیسے بادلوں پر سوار ہو، برق سے آشنائی استوار کرنے کا خواہاں ہو اور شفق سے میل جول بڑھانے کی فکر میں ہو:

شفق کے ویک اینڈ پر، میں چہل قدمی کرتا ہوں
یادوں کی بندرگاہ پر:
نہیں جانتا، اور کتنے دن میں یہاں
ہوں۔ (شفق کے ویک اینڈ پر)

....

ایک ویک اینڈ سے لوٹتے ہی اگلے کا منصوبہ بنانے لگتا۔ "اگلے ویک اینڈ پر کیا کر رہے ہو، حامد؟" وہ دائیں کاندھے پر چمڑے کا سیاہ تھیلا لٹکائے تیسرے پہر دفتر سے براستہ لیڈن گھر واپس جاتے ہوئے فٹ پاتھ پر رک کر اچانک سوال کرتا اور پھر میری تساہل آمادہ ٹال مٹول سنے بغیر اپنی بات مکمل کر دیتا:

ایسا کرتے ہیں کہ ہالینڈ چلتے ہیں، ایمسٹرڈم، ایمسٹرڈم --- فان گوخ میوزیم دیکھتے ہیں --- پیرس کے لوورے میوزیم جیسا بڑا تو نہیں ہے مگر اہم ہے۔ ہاں ٹھیک ہے، یہ بہت اچھا پروگرام رہے گا، ایک دن ایمسٹرڈم میں --- طاہرہ کو بھی بتا دینا --- مل کر جائیں گے، بہت اچھا لگے گا --- موسم بھی غضب کا ہے، دیکھو، دیکھو، دیکھو نا۔ او، مائی گاڈ --- کیسا حسین ہے

یہ یورپ کا موسم--- یہاں آنے کا موقع ملا
ہے تو یہاں کے کلاسیکی فنی شہ پارے کیوں
نہ دیکھیں جو زندگی اور روشنی کی علامت ہیں:
تمہاری انگوٹھی سے پھوٹتی روشنی، سارے
شہر کو، قدیم کلاسیکی طرزِ تعمیر میں ڈھال
دیتی ہے
میں فن کے کسی شاہکار پر دستک دیتا ہوں
اور یکا یک گھنگرو سے بج اٹھتے ہیں
میں محسوس کرتا ہوں کہ درحقیقت زندگی
میں کوئی حقیقی زندگی نہیں؛
تم بھی علامت ہو۔ (علامت)

.....

اور پھر ایک دن استعاروں اور علامتوں سے
باہر موسمی پھولوں سے مہکتی بالکنی کی ریلنگ پر
کہنیاں ٹکائے ڈھلتی شام کے رنگوں کو
گھورتے ہوئے اداس لہجے میں کہنے لگا:
''دوست، اماں بہت یاد آرہی ہے، بہنوں
للی اور مونی سے بات ہوئی لیکن جی نہیں
بھرا، انھیں دیکھنے کو من کرتا ہے--- اماں
اِس موسم میں ناریل کی مٹھائی بناتی ہے، کیا
بتاؤں کیسا ذائقہ ہوتا ہے اس کا!--- تم
ڈھاکا آؤ گے تو تمھیں بھی ضرور کھلاؤں گا
اور کومیلا بھی چلیں گے۔ ہمارے پرانے گھر
کا دالان اور وہ گنگناتے پیڑ اور مون سون
کی پراسرار، من چلی بارشیں---اس کا دل
گویا اڑتا چلا جا رہا تھا:
مون سون کی رُت میں، میرا یہ دل اکثر
اِک آوارہ بادل میں ڈھل جاتا ہے---''
(گیت)
وہ کہتا چلا گیا:
''اور ہاں، تم آؤ گے تو میٹھا میٹھا کٹھل بھی
کھلاؤں گا تمھیں، اوہائے گڈ گاڈ، بہت اچھا
لگے گا تمھیں۔ غالب اور اقبال بھی کھائیں گے
تو آم کی لذت کو بھول جائیں گے۔ ایسا
مزیدار ہوتا ہے کٹھل، جیک فروٹ--- تم آنا
ڈھاکا، تمھیں کھلاؤں گا۔''
''کیا غالب اور اقبال کو لیتا آؤں ساتھ؟''
میں نے شرارت سے پوچھا۔
''نہیں، نہیں انہیں لانے کی ضرورت نہیں
ہوگی۔ وہ پہلے سے وہاں موجود ہوں
گے۔'' جاہد نے بھی ہنستے ہوئے جواب
دیا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کھوئے
کھوئے لہجہ میں کہنے لگا:
''وہاں، وہاں اور بھی بہت کچھ ہے---
دوست ہیں، باغات ہیں، ریڈیو ہے،
تھیٹر ہے--- شہید مینار بھی ہے جو مجھے نہیں
بھولتا--- خاموش کھڑا شہید مینار---!
میں جب بھی تجھے یوں ساکن کھڑا دیکھتا ہوں
تو مجھے شہید مینار یاد آجاتا ہے
دردناک یادوں سے بھرپور

تیری آنکھوں میں یہ سمندر سا کیا ہے؟
(خاموش انسان)

.....

ایک خود کلامی ابھی جاری تھی: ''لہو کے ایک دردناک سمندر میں بھی بہت لوگ جان سے گئے تھے، حامد--- بہت پیارے لوگ جان سے چلے گئے تھے - - -او مائے گڈ گاڈ--- کیسے کیسے لوگ! اب اس کا دل اس کی آنکھوں سے کچھ یوں چھلکنے لگتا تھا کہ چھپائے نہ چھپتا تھا- تب اُس کا دل مجھے قاضی نذرالاسلام کا ''قلبِ تپاں'' محسوس ہونے لگتا جسے مخاطب کر کے ''نذرُل'' کہا کرتا تھا:

اے میرے طائرِ مجروح، میرے قلبِ تپاں
ذرا بتا تو سہی، میں تجھے چھپاؤں کہاں؟ (منظوم ترجمہ: یزدانی جالندھری)

''کیا کیا بتاؤں اور کیا کیا چھپاؤں!--- ہماری زبان، ہماری داستان، ہماری تاریخ--- تاریخ بہت دکھ دیتی ہے نا؟ ہاں، بہت دکھ دیتی ہے - - -اچھی شاعری کی طرح، بہت دکھ دیتی ہے- ہر ادبی فن پارے میں دکھ ہی تو بکھرا ہوا ہے- نہیں کیا؟ ورنہ غالب کیوں کہتا:

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی''۔

یہ شعر پڑھتے ہوئے جاہد کسی طویل باطنی سفر پر روانہ ہو جاتا- صوفے کے بازو پر ٹکا رکھے کا شعری مجموعہ، میز پر پڑی پھولدار پلیٹ میں ننھی منھی خشک ہسپانوی مچھلیوں کا سالن، ابلے ہوئے خوشبودار سفید چاول، ملی جلی سبزیوں کا اچار، ہری مرچ اور میں--- ہم سبھی اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگتے- یہ سوچنے لگتے کہ آخر وہ جاتا کہاں ہے! کسی اور زمانے میں؟ کسی اور جہت میں؟ کسی اور دنیا میں؟ شاید کسی سے ملنے! ڈاونچی سے استفسار کرنے؟ یا شاید مونالیزا کے تبسم کی اداسی کا سبب جاننے!--- شاید:

تمہارے لبوں کی چمک نے
اداسی تبسم سے پائی
پر آخر اُداسی ہی کیوں!
کچھ نہیں جانتا میں
اِن آنکھوں کے نیچے، خموشی سے تم
جمع کرتی ہو کیوں
روح کی دکھ بھری روشنی!
ہیں تمہاری ہنسی میں نہاں
آنسوؤں میں گھرے
کن زمانوں کے منظر!
یہ اندر کا گہرا سفر، طیش،
ترکِ تعلق کی دل چسپ باتیں
تمہیں دیکھنے آیا ہوں جس خوشی سے
وہ ساری خوشی غم سے منسوب کرتا ہوں

میں۔ (مونالیزا)

.....

ایک رات وہ کولون کی سرد اداسی میں لپٹی
جھیل کے کنارے چوبی بنچ پر بیٹھا دور
زردی مائل چاند کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے
دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں تھما سگریٹ
دھیمے دھیمے شعلے کے پہلو سے سہما سہما دھواں
آزاد کرتا جا رہا تھا اور جاہد سوچ رہا تھا:
جب میں چاند کو چھونے لگتا ہوں
تو ایک سلگتا ہوا ایش ٹرے میرے ہاتھ میں
آجاتا ہے
میں سگریٹ پیتا ہوں
خواب کی بیماری سے میری آنکھیں سرخ
ہو جاتی ہیں۔ (بیماری کی داستان)

میں جانتا تھا کہ خواب کا رشتہ رات سے ہے
اور رات کا چاند سے۔ چاند کلام کرتا ہے
شب گزیدگان سے چاندنی کی زبان
میں۔ چاند سے ہم کلام ان شب گزیدگان
میں کون ہوگا کہ سینے میں درد کی لو نہ رکھتا ہو۔
رات بھر درد کشید کرنے والے دل صبح دم
جانے کس کا انتظار کرتے ہیں۔ جناب احمد
ندیم قاسمی کہتے ہیں:
چمکا ہے جو میرے دل میں شب بھر
اُس درد کی چاندنی میں آنا

.....

ایسی ہی ایک چاندنی شب میں ایک خواب
ناک محفل امجد علی کے اپارٹمنٹ میں گرم
تھی۔ مشرق و مغرب کے فنی، سیاسی اور
تاریخی موازنے زوروں پر تھے۔ مغرب
کے لیے کون سا نام زیادہ موزوں رہے
گا: ''جمہوری مغرب'' یا ''عیسائی مغرب''؟
کیوں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف بات
کرنے والوں کو یہاں نہ صرف یہ کہ ہاتھوں
ہاتھ لیا جاتا ہے بلکہ ان کی متوسط درجہ کی
تخلیقات کی بھی خوب تشہیر کی جاتی ہے؟
اصلی تخلیق کار کے اتنے دشمن کیوں ہوتے
ہیں؟ کیوں ایک مقتدر بادشاہ بھی ایک
بے چارے کنگال شاعر سے حسد محسوس
کرتا ہے؟
گوئٹے کیعلاوہ اور کتنے یورپی شاعر ہوں
گے جو مشرق کی فراست کے دلدادہ و
معترف ہوں گے؟
کچھ ایسی ہی سنجیدہ قسم کی باتیں ہو رہی تھیں
جنھیں سننے کے ساتھ ساتھ میں اپنے نئے
وڈیو کیمرے پر فرینکفرٹ مشاعرے کی
ریکارڈنگ بھی دیکھ رہا تھا اور کیمرے کے
ایڈیٹنگ پینل کے ساتھ بھی چھیڑ چھاڑ
کر رہا تھا۔
''یہ کیا تم اپنے کیمرے سے زرناب اور

طاہرہ ہی کو ریکارڈ کیا کرتے ہو!۔ اس کا کچھ بہتر اور پیشہ ورانہ استعمال کرو، ایک فلم بناؤ، وڈیو فلم۔ بہت اچھی رہے گی۔'' جاہد کہنے لگا اور پھر ہمیں تکنیکی طور پر تیار رہنے کا کہہ کر کہانی پر کام کرنے میں جُت گیا۔ تحریر و ہدایات کی ذمہ داری خود سنبھال لی، کیمرہ امجد کے حوالے کیا اور مجھے اداکاری کے میدان میں اتار دیا۔ یوں بنگلہ دیش سے جرمنی آئے ایک نوجوان کی کہانی ''کہاں تک'' کی صورت میں فلمبند ہونے لگی۔ یہ شارٹ وڈیو فلم ''تھری ہارس پکچرز'' کی پہلی اور آخری پیش کش تھی۔

میں نے جاہد سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کہانی کس کی ہے۔ ہاں، یہ ضرور پوچھا کہ یہ تین گھوڑے کون ہیں؟ جواباً بولا: ''بس نام ہے 'تھری ہارس'۔ کچھ نام تو رکھنا ہی ہوتا ہے نا۔'' میں امجد کی طرف مُڑا تو اُس نے مسکراتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں سمجھایا کہ شکر کرو گھوڑا ہی قرار دیا ہے ہمیں، کچھ اور نہیں۔

فلم سازی کے اس تجربے کے دوران میں مجھے پتہ چلا کہ جاہد شاعری ہی نہیں کسی بھی فن پارے میں جزئیات نگاری کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ اس مختصر فلم کی تیاری کے لیے طویل مباحث ہوئے۔ بار بار شارٹس لیے گئے۔ کیمرے کے رُخ کا بار بار تعین کیا گیا اور --- بہت کچھ ہوا مگر فلم بہرحال مکمل ہوگئی۔ ہم خوش تھے مگر پھر بھی:

ایک تاسف تو بہرصورت باقی رہتا ہے
کہ زندگی تو صرف ایک بار ملتی ہے اور وہ بھی ریزہ ریزہ
اور یہ اثاثہ ہے ناکامیوں کا---
ہاں، اتنا سوچا ضرور کہ کاش میں تمہیں کوئی لازوال شے دے سکتا! (دوپہر)

عارضی سا انسان کسی کو کیا لازوال تحفہ پیش کر سکتا ہے۔ بہرحال میں نے اپنی سی کوشش کی اور کولون، جرمنی میں جاہد کے قیام کے حوالہ سے ایک دستاویزی فلم بھی بنا ڈالی: ''ایک شاعر، کولون میں'' کے نام سے۔ جس میں جاہدالحق کے شب و روز کے چیدہ چیدہ مناظر محفوظ کر لیے۔ اس کا گھر، اس کا دفتر، اس کا راستہ، شام کی سیر اور شعر گوئی۔ اس دستاویزی فلم کی ایک کاپی میں نے اسے بھی دے دی اس امید کے ساتھ کہ وقت کے جنگل میں عمر کا سفر طے کرتے ہوئے کبھی ستانے کو رُکے گا تو شاید یہ یادیں اس کی تسکین کا ساماں بن جائیں۔

اس دستاویز میں مناظر تھے، چلتا پھرتا جاہد الحق تھا، ریڈیو کے لیے پروگرام تیار کرتا ہوا، کیوسک سے سگریٹ خریدتا ہوا، عینک ناک پر ٹکائے آرام کرسی پر نیم دراز دل ہی دل میں اپنی نظمیں پڑھتا ہوا:

پینگوئن کا شعری مجموعہ
تم نے ہمیں دیا تھا--- ہے
تم نے ہمیں دیا تھا پارکر کا جو پین
لکھنے کو--- وہ ہے
آسمان سے مٹھی بھر نیلاہٹ
جو تم نے دی تھی--- ہے
اپنی سانسوں سے لبریز سینہ بھر خوشبو
جو تم نے دی تھی--- ہے
اور اس ان دیئے میں سے
جو لامحدود تم نے دیا تھا--- وہ بھی
ہے۔ (تحفہ)

....

کہنے کو اس دستاویزی فلم میں کیا کچھ نہ تھا حتیٰ کہ پس منظر موسیقی بھی تھی۔ اگر کچھ نہ تھا تو وہ تھا مکالمہ۔ جس کے لیے ڈاکومنٹری کے آخری منظر تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آخری منظر جب جاہد الحق اپنے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھا ہے۔ اچانک فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نگاہ ایرش فریڈ کے شعری مجموعے سے ہٹاتے ہوئے ریسیور اٹھاتا ہے اور کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد لہجے میں کہتا ہے:

''آ ئی --- جاہد الحق ۔'' ---یعنی:

''میں--- جاہد الحق''۔

یوں دیکھنے والوں سے اس کا یہ یک طرفہ یا ادھورا مکالمہ میری ڈاکومنٹری فلم کو یعنی ووتی کے خلوص آگیں تحفے کو مکمل کر دیتا ہے۔

جاہد الحق ایک کھرا فن کار ہے اور وہ فن اور فن کار دونوں سے محبت کرتا ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا فنون کے ضمن میں وہ محدودیت کا قائل نہیں یعنی وہ صرف شاعری یا شاعروں ہی کو نہیں سراہتا بلکہ تصویر کشی، مصوری، فلم، ڈرامہ اور موسیقی کی بھی خوب پذیرائی کرتا ہے۔ یورپ میں قیام کے دنوں میں وہ جرمنی کے اندر ہی نہیں گھوما بلکہ اس نے آس پاس کے اور بھی کئی ملک کھنگال ڈالے۔ وہاں کے فنی اثاثوں کو دیکھا، وہاں کی ثقافتی اقدار کا مشاہدہ کیا، وہاں کی صبحوں کو محسوس کیا اور وہاں کی شاموں کو اپنی نظموں میں پرویا جن میں سے کچھ نظمیں میں نے اس کے ساتھ مل کر اردو کے قالب میں ڈھال لیں۔ جاہد کی یہ نظمیں جرمنی اور ڈھاکا کے اردو مشاعروں میں خوب سراہی گئیں خاص کر اس کی نظم ''الوداع'' کی گونج جرمنی کی اردو فضا میں

تادیر سنائی دیتی رہی جس میں وہ کہتا ہے:

جانا ہے تو جاؤ
لیکن ٹکٹ کٹانے سے پہلے
اک لمحے کو سوچنا 'تم کو کہیں نہیں جانا'
آخر تم کیوں جاؤ گی
دوری کی دھند بڑھاؤ گی!

سنو، سنو کاؤنٹر پر کہنا:

''اک ٹکٹ --- کہیں نہ جانے کا!
(الوداع)

ہمارے لیے وقت واقعی تھم سا گیا تھا۔ زندگی معمول کی ایک ڈگر پر رواں دواں تھی مگر ہمیں کہیں بھی تو نہیں جانا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ موسم مستقل رہے گا؛ ایک جاری وساری بہار چھائی رہے گی مگر جانے کب اور کیسے، شاید جاہد کی کسی نظم کا تعاقب کرتے ہوئے، زرد پتے گرنے کا موسم ہماری زندگیوں میں بھی در آیا--- وہ دن آن پہنچا جب ریڈیو ڈوچے ویلے میں مدت ملازمت پوری ہونے پر جاہد کو واپس اپنے ڈھاکا جانا تھا۔ اس دن کولون کی سڑکوں کے کنارے دور یہ کھلی جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں، دریائے رائن کی مسحور کن لہروں کے دوش پر، آبی پرندوں سے اٹے کال شوئرر تالاب کے گرداگرد پھیلے سبزہ زار کی فضاؤں میں، تاریخی کیتھڈرل 'ڈوم' کے پہلو میں بھٹکتی مخمور ہواؤں میں اسی کی نظم کے یہ مصرعے مہک رہے تھے:

اور پھر
یہ دن بھیگتا جا رہا ہے یادوں کے احساس سے
فراموشی کے نیل پر، میں دیکھ رہا ہوں
اپنا ہی سایہ--- کانپتا ہوا، لرزتا ہوا
مگر کیا کروں؟ جانتا ہوں کہ کہا نہیں کرتے:
''رُک جاؤ''۔ (الوداع)

سو، وہ رُکا نہیں۔ وقت کبھی رکتا ہے کیا!--- اور پھر میں بھی اپنے لاہور لوٹ گیا--- اس سے بچھڑنے کے دکھ سے قطعِ نظر میں یہ سوچ کر خوش تھا کہ جاہد واپس اپنے منظر میں لوٹ گیا ہے، اپنے بابا کی یادوں کے پاس اور اپنی ماں کے آنچل کے شفیق سائے میں جسے وہ حرف حرف اپنی نظم کے تار و پود میں سمویا کرتا تھا:

اپنے بابا کی قبر کو مس کر کے، صحن کے تالاب کو عبور کرتے ہوئے
سسکیاں بھرتا، میں موسمِ گرما میں دمکتے چودھویں کے چاند سے نیچے اتر آؤں
اور بس رو دُوں۔ تمہارے آنچل کے دریچے سے لگ کر رو دُوں۔
ماں! میں واپس آ گیا ہوں
ماں! میں واپس آ گیا ہوں۔ (واپسی)

سفر چاہے کتنا بھی طویل ہو اس سے واپسی تو

ہوتی ہی ہے۔ ہم بھی لوٹ آئے تھے جرمنی سے۔ جہاں مشرقی اور مغربی حصوں کے فاصلے مٹ چکے تھے مگر نہ جانے کب وقت نے عدم رابطہ کی ایک دیوار برلن سی اِدھر ہمارے درمیان اٹھادی تھی۔ ہمارے بیچ میں جانے کب، کیسے خاموشی کا گویا ایک عہد حائل ہوتا چلا گیا تھا۔ اسی خاموشی کو ساتھ لئے میں مستقل طور پر کینیڈا آبسا۔

جاہد ڈھاکا میں رہا مگر شعری محفلوں میں شرکت کے لیے ملکوں ملکوں گھومتا رہا۔ شاعری سنتا اور سناتا رہا۔ اس کی کتابیں بھی شائع ہوتی رہیں اور ان کی پزیرائی بھی ہوتی رہی۔ اس دوران میں اس نے شاعری کے ساتھ ساتھ ناول بھی لکھے اور افسانے بھی اور اپنی ادبی کارکردگی کے صلہ میں ملک کا سب بڑا ادبی اعزاز بھی حاصل کرلیا جس کی خواہش اس کے دل ورویش میں بھی چٹکی بھر جایا کرتی تھی۔

پھر عرصہ بعد خط و کتابت نے ہمارے درمیان رابطہ کچھ کچھ بحال کیا۔۔ بے قاعدہ سا رابطہ۔۔۔ اب کچھ دن ہوئے ہیں کہ سماجی روابط نے برقیاتی استعانت سے استفادہ کرتے ہوئے جو عالمی جال بچھایا ہے اس میں ہم سب جکڑے گئے ہیں۔ اس جال نے ہمیں دُور رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے قدرے مربوط کردیا ہے۔ اب میں فیس بک پر جاہد کے نت نئے شعری مجموعوں سے متعارف ہوسکتا ہوں، اس کی ادبی مصروفیات کی خبر رکھ سکتا ہوں اور اس کی تازہ ترین تصویر بھی دیکھ سکتا ہوں۔۔۔ ایک منجھے ہوئے تخلیق کار کی تصویر، ایک پُرخلوص دوست کی تصویر:

اک کھلتی تصویر
سینے میں در وا کرتی اک روشن سی تصویر۔۔۔
۔۔۔ دیکھو نا، ارے دیکھو نا!
کیا تمہیں یہ تصویر دکھائی دیتی ہے؟
ابھی ابھی مری آنکھیں تم کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ (تصویر)

پھر سوچتا ہوں تصویر کتنی بھی یادگار کیوں نہ ہو مگر ہے تو تو عکس ہی۔۔ اصل جاہد تو اپنی شاعری میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔۔ اُسے ڈھونڈنے ہمیں ادھر ہی جانا پڑے گا۔ اگر یقین نہ آئے تو اک ذرا دستک دے کر دیکھیے "فن کے کسی بھی شاہکار پر"، اُس کی کسی بھی نظم پر۔ جاہدالحق آپ کے سامنے کھڑا ہو گا کسی ان چھوئی خوب صورت علامت کی طرح:

"ہیلو، آ می جاہدالحق۔۔"

وہ کہے گا ایک سوچتی ہوئی مسکان کے ساتھ۔

☆☆☆☆☆

نذر عابد: کنارِ خواب کا تشنہ مسافر

ڈاکٹر نذر عابد کی زیرِ نظر شعری کاوش عنوان کے اعتبار سے ایک رومانوی کنایہ ہے۔ ''کنارِ خواب'' میں کنارِ راوی' کنارِ نیلم' کنارِ جہلم' کنارِ وادی وغیرہ کا سا گماں ہوتا ہے اور بے اختیار اس مجموعے کا جائزہ لینے کے لیے قاری کی باطنی کائنات میں ایک جمالیاتی حس بیدار ہوتی ہے۔ اس کے پس ورق پر درج تبصروں میں ڈاکٹر وزیر آغا ایسی قدآور شخصیت کی رائے بھی بجائے خود ڈاکٹر نذر عابد کے لیے وجہِ افتخار اور ان کے شعری مجموعے کے لیے وجہِ زینت ہے۔ نذر عابد کے ہاں زندگی کی روشن قدروں کے فروغ کے لیے پائے جانے والے شعری رویّے پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''نذر عابد کے ہاں روشنی کے حصول کا عمل دوہرا ہے۔ ایک طرف تو وہ اس بات کا طالب ہے کہ روشنی اس کے گھر میں داخل ہو دوسری طرف وہ چاہتا ہے کہ اس کے پر اُگ آئیں اور وہ تاریکی کے جال سے نکل کر خود سورج کی طرف پرواز کر جائے۔ تیرگی سے نجات پانے اور روشنی تک پرواز کرنے کی اس طلب ہی نے نذر عابد کے کلام کو خوبصورت بنایا ہے۔''(۱)

''اپنی بات'' میں نذر عابد شاعر کو ایسے تخیل کا سزاوار قرار دیتے ہیں جو نسلِ انسانی کے لیے قوتِ عمل' مشعلِ راہ اور مقصدِ حیات بنے یا بننے کے لائق ہو۔ بعد ازاں ڈاکٹر محمد سفیان صفی ہمیں نذر عابد کی شخصیت' فکر اور شعریت سے اجمالی طور پر آگاہ کرتے ہیں تو ڈاکٹر ریاض مجید ان کے محاسن شعری کو مجموعہ مذکورہ میں شامل تخلیقات کے تناظر میں بیان کر کے قاری کو ایک خوش گوار احساس کے ساتھ کتاب کے مطالعے پر مائل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض مجید ان کے

نثار ترابی

غزلیہ اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''نذر عابد کی غزلوں میں اسلوب کے تکمیل یاب ہونے اور اسے بہ ہر پہلو اطمینان بخش سطح پر متمکن کرنے کے لیے ایک دلآویز زور آزمائی کی کیفیات بہت واضح ہیں۔ معنی کو لفظ آشنا کرنے اور خواب کو اظہار یاب کرنے کی اس مسلسل تگ و دو میں اس نے جو شعری اثاثہ [کنارِ خواب] تخلیق کیا وہ ''مظہرِ صدا'' [اوّلین شعری مجموعہ] کی نسبت زیادہ جذب افزا اور تاثر آفریں ہے۔''(۲)

ایک سو چھہتر صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کلام کا باقاعدہ آغاز اس کے اکیسویں صفحے سے ہوتا ہے جہاں حمدیہ طرز کی ایک غزل پیش کی گئی ہے۔ غزل کے مقطع میں وہ خود بھی اس بات کا اثبات یوں کرتے ہیں:

عابد میں کیا کہوں بھلا اُس کا یہ التفات ہے
میں نے تو اک غزل کہی دیکھو ثنا میں ڈھل گئی
(کنارِ خواب: ص ۲۱)

اس کے فوراً بعد سہلِ ممتنع کا ایسا نمونہ جس پر بادی النظر میں ایمائیت نگاری کا گماں گزرتا ہے، بطور غزل پیش کر کے اپنی بلند فکری کا تاثر ابتدا ہی میں قائم کر دیتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

بے گھر ہونا ایک عذاب کی صورت ہے
وہ کیا جانے جس کا گھر تبدیل ہوا
(کنارِ خواب: ص ۲۳)

اور اسی غزل کا مقطع بھی پیش ہے:

تاریکی اک لہر کی صورت پھیل گئی
دود میں شعلہ جب بجھ کر تبدیل ہوا
(کنارِ خواب: ص ۲۴)

نذر عابد کے یہاں مناظر کی تبدیلی کا احساس زندگی کی نو بہ نو تبدیلیوں کو تمثیلاً فلموں میں مناظر کی تبدیلی کی طرح دکھانا بھی واضح ہے۔ تمثیل نگاری سے اُن کی تخلیقی رغبت ابتدا ہی سے نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اِس ضمن میں اُن کی غزل کا یہ مطلع دیکھیے:

آخر کیسے اور کیوں کر تبدیل ہوا
دیکھو پھر سے ہر منظر تبدیل ہوا
(کنارِ خواب: ص ۲۳)

اور یہی نہیں بلکہ اس سے اگلی غزل میں تو ''عجیب منظر تھا'' کی ردیف کو بنیاد بنا کر پوری غزل مکمل کی ہے مذکورہ غزل سے دو شعر اس طرح ہیں:

نہیں تھی چشم کوئی تر عجیب منظر تھا
کسی کے جانے کا منظر عجیب منظر تھا
اُبھرتے ڈوبتے چہرے نظر میں تھے عابد
میں دیکھتا تھا پلٹ کر عجیب منظر تھا
(کنارِ خواب: ص ۲۵)

تخلیق شعر میں نت نئے تجربات کرنا اگر ادب کی جان ہے تو قدما کا تتبع اور اس پر اک گونہ تفاخر کا پایا جانا آداب کی رعایت سے بھی شعری روایت میں شامل ہے اور اسے کسی شاعر کی تخلیقی شان بھی تصور کیا جاتا ہے۔ نذر عابد کے یہاں ہر دو کا شعوری

التزام ملتا ہے۔ میر کی زمین میں کہی گئی اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

کیا غزل تم نے چھیڑ دی عابد
میر صاحب کی یاد آئی ہے
(کنارِ خواب: ص ۳۲)

اگر چہ مندرجہ بالا شعر میں ''میر صاحب'' سے مراد خدائے سخن میر تقی میر ہی ہیں۔ تاہم میر کے ساتھ صاحب کا اضافہ کرنا جہاں اوزان برابر رکھنے میں ممد و معاون ہے۔ وہیں ایمائیت بھی پیدا کرتا ہے اور استعارے میں جامعیت کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس لیے کہ اُردو شاعری میں میر درد، میر سوز، میر حسن اور میر تقی میر سب ہی بلند پایہ شعراء ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جو مقام میر تقی میر کو ملا، دیگر اس سے بہرہ ور نہ ہو پائے لیکن اپنی اپنی سطح و معیار پر یہ سبھی شعراء خصوصی مقام کے حامل ہیں۔

فنی سلیقے کے ساتھ تلمیحات اور استعارات کا استعمال بھی سخن وری کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اگر چہ تخلیقِ شعر کے باب میں کسی شاعر کو یہ تخلیقی عمل بظاہر بہت آسان دکھائی دیتا ہے لیکن اسے ہنر مندی سے یوں برتنا کہ خیال و افکار کا تسلسل اور خیال کی روانی نہ ٹوٹے، شاعری کا آہنگ برقرار رہے اور تلمیح یا استعارے کو شعر کی انگوٹھی میں مثل نگینہ جڑ دیا جائے، خاصا مشکل اور اصل کاری گری ہے۔ نذر عابد کے یہاں نہ صرف یہ کہ اس کاری گری کا حسن موجود ہے بلکہ یہ دور سے اپنی پہچان بھی کراتا ہے:

میرے آذر دستِ ہنر کو پھر سے جگا
میری ذات کے سارے پتھر نیند میں ہیں
(کنارِ خواب: ص ۳۵)

غالب آنے والے ہیں اصحاب فیل
اور ابابیلوں کے لشکر نیند میں ہیں
(کنارِ خواب: ص ۳۶)

ایک حساس اور دردمند تخلیق کار کی طرح نذر عابد کے یہاں بھی قومی عصری صورت حال کا فکر انگیز تجزیہ معاصر سیاسی زبوں حالی کے نقش ابھارتا ہے۔ ایک انسان دوست شاعر اپنے وطن اور اس پر گزرنے والی قیامتوں کو کس کرب سے محسوس کرتا ہے اس کے شعری مظاہر نذر عابد کے ہاں یوں تو کئی مقامات پر نمایاں ہوئے ہیں مگر سر دست اس کی ایک مثال مذکورہ غزل میں شامل یہ شعر بھی ہے:

حفظ و امان کی خواہش جاگتی ہے لیکن
رہزن تو بیدار ہیں، رہبر نیند میں ہیں
(کنارِ خواب: ص ۳۵)

اس ایک شعر میں قیام پاکستان سے لمحۂ موجود تک کی زمانی مدت میں قومی سیاست اور قومی سیاست دانوں کی اکثریت نے پاکستانی سماج اور معاشرت کو جس عصری عبرت سرا میں پہنچا دیا ہے اس کا لب لباب شاید یہی ہے کہ ''رہزن تو بیدار ہیں، رہبر نیند میں ہیں''۔

سماج کے باطن سے پھوٹنے والی عصری صورت حال کا دردمندانہ تجزیہ اور ترجمانی نذر عابد کے شاعرانہ فکر و خیال کا ایک نمایاں

زاویہ ہے جو ان کے کئی اشعار میں عصری حسیت کی شاعرانہ پکار بن کر منظوم ہوا ہے۔ نذر عابد کے ہاں اپنے عہد کے سماجی مسائل اور معاملات کی تفہیم کے اسی زاویے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عامر سہیل لکھتے ہیں:

''نذر عابد کی شاعری میں زندگی سے وابستہ رڈیوں اور آدرشوں کا ایک جہان آباد ہے۔ اس شاعری میں ہمیں زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ سماجی رڈیوں کی حدّت اور شدّت نے فنِ شعر کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ غزل کی صحت مند روایت جدید رجحانات کو بطریقِ احسن محفوظ کرتی چلی جاتی ہے۔'' (۳)

کہا جاتا ہے کہ ابلاغ اور درست انداز میں ایک شخص کا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا دینا اور اس میں کامیابی حاصل کر لینا اگرچہ پھولوں کی سیج معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت یہ کانٹوں کی سیج ہے۔ خیالات سے بے گانگی' ذہنی صلاحیت و کیفیت کا فرق اور مخاطب کی بات کو درخورِ اعتنا نہ جاننا' اس کی اختیاری رکاوٹیں ہیں۔ اکثر سخن وروں کو اس بات کا شکوہ رہا ہے کہ ابلاغ کے تمام تر اسباب اختیار کرنے کے بعد بھی مطلوب و مقصود یعنی من و عن تفہیمِ کلام نہیں ہو پاتی۔ نذر عابد بھی اسی مشکل میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ تاہم وہ ایسے واقفانِ حال میں سے ہیں جو اس اختیاری گریز سے بھی واقف ہیں جو مخاطب کی جانب سے قصداً روا رکھا جاتا ہے اور ایسے میں متکلم کو اندازِ بیاں کا دوش دے کر پہلو بچانے کی جو کوشش کی جاتی ہے وہ ان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایک غزل میں ان خیالات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں:

قفل پڑے ہیں دل کے سب دروازوں پر
کیسے اور کیوں کر سمجھائیں اپنی بات
آنے والی نسلیں ممکن ہے سمجھیں
لوحِ وقت پہ لکھتے جائیں اپنی بات
(کنارِ خواب: ص ۴۱)

اور دانستہ گریز پر یوں چوٹ کرتے ہیں:

سچ تو آخر سچ ہے' کڑوا ہوتا ہے
کتنی شیریں اور بنائیں اپنی بات
(کنارِ خواب: ص ۴۱)

اس غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے غالب کے یہ شعر ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
(۴)

اور

یا ربّ! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
(۵)

زیرِ نظر شعری مجموعے میں ''میرے خواب'' کی ردیف پر یکے بعد دیگرے تین غزلیں متواتر تخلیق کی گئی ہیں جن میں جمالیات کے داخلی طرزِ احساس کے ساتھ ساتھ اسلوب کی

دل نشینی نذر عابد کا وسیع مطالعہ، ان کی بلند خیالی، اور رومانویت پسندانہ کیفیات کی مصوری جیسے سبھی فنی مظاہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے یہاں ''خواب'' خواہش بھی ہے اور امید بھی، خواب ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی، خواب یاس بھی ہے اور نراس بھی، خواب حسرت بھی ہے اور تکمیل بھی خواب ایک انفرادی جذبہ بھی ہے اور آفاقی حقیقت بھی، خواب ایک ماورائی کیفیت بھی ہے اور روحانی تجربہ بھی۔ تخلیقی زندگی میں خواب دیکھنے اور دکھانے کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے خود نذر عابد کا کہنا ہے:

''تخلیقِ ادب انتہائی سنجیدہ اور ذمہ دارانہ سماجی عمل ہے۔ میرے خیال میں ہر لکھنے والے کے اپنے کچھ خواب ہوتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح کے خواب دیکھنا اور اپنے لوگوں کو دکھانا ہر ادیب اور شاعر کی سماجی ذمہ داری ہے۔''(۲)

گویا شاعر کے نزدیک ہر قسم کی حرکی کیفیت، خواہش، ارادہ اور عمل جب بھی کسی ایک ہیئت سے روبہ تغیر ہو کر دوسری حالت میں سفر کرتا ہے تو اس کا اوّلین محرک خواب ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی کل افکار عالم قرار واقعی ''کنارِ خواب'' میں عدم وجود اور فنا سے دوچار ہوتے ہیں۔ خواب اُن کے درمیان ربط بھی ہے اور ضبط بھی اور حقائق کی دنیا میں رہ جانے والی کی کا نعم البدل بھی۔ خواب کو اتنی مختلف انواع میں برتنا بھی خواب وخیال ہی لگتا ہے۔ لیکن شاعر کے یہاں یہ وصف حقیقت کا روپ اختیار کرتے ہوئے ایک مجسم شکل میں ہمارے روبرو آتا ہے۔ نذر عابد کی شاعری میں ان کی انفرادی اور اجتماعی آرزوؤں اور آدرشوں کی تکمیل کی خواہش کے تحت خوابوں کا ایک مسلسل تذکرہ ملتا ہے۔ اوپر ذکر کیے گئے ان کے طویل سہ غزلے کی ردیف ہی ''میرے خواب'' ہے۔ اس طویل غزل میں حسنِ فطرت، حسنِ بشر اور حسنِ معاشرت کے تناظر میں نذر عابد کے خوابوں کا ایک سلسلہ وار تذکرہ موجود ہے:

جگنو، سورج، چاند، ستارے میرے خواب
کتنے روشن، کتنے پیارے میرے خواب
(کنارِ خواب: ص ۴۳)

حسن نگر کے درشن سارے میرے خواب
ساری رمزیں اور اشارے میرے خواب
(کنارِ خواب: ص ۴۵)

دیواروں کے اکھڑے رنگ، مری بنیاد
ٹوٹی گلیوں کے چوبارے میرے خواب
(کنارِ خواب: ص ۴۷)

اسی طرح ان کی ایک غزل کی ردیف ہے ''اجنبی شہر میں''۔ مذکورہ غزل بھی وسعتِ خیال اور ندرتِ خیال کی ایک عمدہ مثال ہیوں تو سبھی اشعار دامنِ دل کھینچتے ہیں۔ مگر اس غزل کا یہ شعر:

دکھ بہت تھے مگر سب سے بڑھ کر یہ تھا
کس سے دکھ بانٹتے اجنبی شہر میں
(کنارِ خواب: ص ۵۲)

ایسا ہے جو اپنے مرکزی خیال کی بنا پر اور ردیف کے اشتراک سے ہمارے ذہن کو سفر کی دہائی میں معروف ہونے والے اس مقبول فلمی گیت کی طرف موڑ دیتا ہے جسے ممتاز شاعر نذیر قیصر نے لکھا تھا اور جس کو سریلے رسیلے گلوکار مجیب عالم نے بڑے لگاؤ سے گایا تھا۔ آج بھی اس گیت کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس گیت کا مکھڑا ہے:

میں ترے اجنبی شہر میں
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تجھے
مجھ کو آواز دے، مجھ کو آواز دے

''کنارِ خواب'' میں موجود شاعری کا مطالعہ اپنی موضوعاتی رنگا رنگی کے سبب ہمیں بیک وقت رومانویت 'مقصدیت' یاسیت اور رجائیت کی ملی جلی کیفیات سے مزین ملتا ہے۔ جذبات اور احساسات اپنی اپنی جگہ پر مختلف رنگوں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ نذر عابد غزل کی صنف کے کثیر الموضوعی ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسے ایک جامع فن پارے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ خود ان ہی کے ایک شعر سے جس کی تشریح ہوتی ہے:

رنگوں کے انتخاب کا عابد ہے مرحلہ
پوروں سے چھن رہا ہے ہنر بولتا ہوا
(کنارِ خواب: ص ۲۵)

نذر عابد نے ''کنارِ خواب'' کے ابتدائیے میں ''اپنی بات'' کے تحت جن خوابوں کی کاشت کا تذکرہ کیا ہے، ان کا تکمیلی مراحل سے ہم کنار ہونا ہنوز خواب و خیال سہی لیکن یہ بات کیا کم ہے کہ شاعر نے ایک خوبصورت اور متوازن سماج کے حوالے سے جو خواب دیکھے وہ بھرپور شعری ذمہ داری کے ساتھ نہ صرف اپنے لوگوں کو دکھائے بلکہ ان کی تکمیل کے لیے جدوجہد کے رستے بھی سجھائے۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ نذر عابد خواب کے پر پیچ راستوں کا وہ تشنہ مسافر ہے جو اپنے خوابوں کی سیرابی و شادابی کی منزل کی طرف مسلسل رواں دواں ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، پس ورق، کنارِ خواب، قرطاس فیصل آباد، ۲۰۱۲ء
۲۔ ڈاکٹر ریاض مجید، ''نئی غزل کا حوالہ''، مشمولہ کنارِ خواب، ص ۱۶
۳۔ عامر سہیل، ''نذر عابد کی شاعری کا سماجی پہلو'' مشمولہ سہ ماہی شعر و سخن مانسہرہ، جولائی رستمبر ۲۰۱۴ء، ص ۱۲
۴۔ اسد اللہ خان غالب مشمولہ دیوانِ غالب، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۷۰
۵۔ اسد اللہ خان غالب مشمولہ دیوانِ غالب، ص ۱۱۷
۶۔ نذر عابد، انٹرویو مشمولہ روزنامہ پاکستان سنڈے سپیشل ۲۵ تا ۳۱ دسمبر ۲۰۱۶ء

☆☆☆☆☆

عذرا اصغر.....شخصیت اور فن

جناب صاحب صدر، مہمانِ خصوصی، محترمہ عذرا اصغر اور خواتین و حضرات! بات کچھ یوں ہے کہ اوائل جولائی کی حبس زدہ گرمی، کورونا کی مکروہ زدہ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھنے کی تنبیہ اور جسم میں زندگی کی حرارت برقرار رکھنے کی مشکلات کے دنوں میں ادب سے محبت رکھنے والے متوالوں کا آج کی شام یوں ایک چھت تلے جمع ہو جانا انیسویں صدی کے مشہور پرتگیزی ادیب Fernando Pessoa کے اس قول کی یاد دلاتا ہے جس میں اس نے کہا تھا'' Litterature is the most agreeable way of ignoring the life''- وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ زندگی کی تلخیوں سے پیچھا چھڑانے کا بہترین طریقہ لٹریچر سے محبت ہے-

اس چھت تلے جمع ہو جانے والے ادب کے محبوّں کی خوش قسمتی یہ ہے کہ جس ادبی سرجیل پر اظہار خیال کرنے کا موقع ملا ہے وہ برصغیر پاک و ہند کی ممتاز ادیبہ محترمہ عذرا اصغر ہیں- یہ ہم اہل پاکستان کی خوش نصیبی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد محترمہ عذرا اصغر پاکستان کے حصے میں آئیں- اس شام چونکہ ہمیں ان کی شخصیت اور فن پر بات کرنا ہے تو میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اقرار کرتا ہوں کہ آج سے پہلے میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی- البتہ میں نے ان کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھی ہیں- اور اس سلسلے میں میری ان سے فون پر بات ہوتی رہی ہے- فون پر بات کرتے ہوئے جس امر کا احساس مجھے شدت سے ہوا وہ یہ تھا کہ وہ بولنے سے زیادہ سننے پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہیں- اور وہ بھی ایک عورت ہو کر! اکثر اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ آپ بولتے جا رہے

عامر رضوی

ہیں مگر ادھر سے مسلسل خاموشی۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی بات مکمل کر لی مگر ادھر سے خاموشی نہیں ٹوٹتی۔ گھبرا کر آپ پوچھ بیٹھتے ہیں محترمہ کیا آپ لائن پر ہیں؟ تب جواب آتا ہے کہ جی میں آپ کو سن رہی ہوں۔ اور پھر وہ آپ کا کہا ہوا دہرا دیتی ہیں۔ شاید یہ زیادہ سننے کی عادت ہی Grist to the mill کے طور پر وہ مشاہدہ ہے جو ان کی زندگی کے قریب ترین کہانیاں بُننے کا باعث بنتا ہے۔

محترمہ عذرا اصغر کی شخصیت کو سمجھنے کے سب سے بڑے دعوے دار اُن کے شوہر جناب اصغر مہدی مرحوم ہیں۔ انہوں نے یہ دعویٰ محترمہ کی مشہور کتاب 'بیسویں صدی کی لڑکی' کے دیباچہ میں کیا ہے۔ انہوں نے علی الاعلان دعویٰ کیا ہے کہ ''عذرا اصغر کی شخصیت کے بارے میں مجھ سے بہتر بھلا کون جان سکتا اور لکھ سکتا ہے۔'' تو خواتین و حضرات! ہم بھلا ان کے اس دعوے سے انکار کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ وہ بتاتے ہیں کہ کہنے کو تو عورت کے چار مدارج ہوتے ہیں، پہلے وہ بیٹی ہوتی ہے پھر بہن، اس کے بعد بیوی اور پھر ماں۔ پھر وہ ایک حوالے سے بتاتے ہیں کہ عورت کا محض ایک ہی درجہ ہوتا ہے، ماں کا۔ وہ ہمیشہ ماں ہوتی ہے اور کچھ نہیں ہوتی۔ ماں سے مراد ممتا ہوتی ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو عذرا عورت کے پانچویں رشتے کی زیادہ قائل ہے۔ وہ رشتہ ہے دوستی کا۔ وہ اس رشتے میں بھی ممتا کی قائل ہے۔ اصغر مہدی بتاتے ہیں کہ عذرا کو کتابوں اور پودوں سے بھی پیار ہے۔ اتنا پیار کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کاش میں ایک کتاب یا پودا ہوتا۔ عذرا اصغر کو کشادہ اور خوبصورت کچن سے محبت ہے۔ مگر کھانا پکانے اور کھانا کھانے سے قطعی رغبت نہیں۔ جتنی مجبوری سے پکاتی ہے اتنی بددلی سے کھاتی ہے۔ البتہ مہمانوں کے لیے ہمیشہ چشم براہ اور ان کے لیے انواع واقسام کے کھانے بنانے میں مستعد رہتی ہے۔ کاش ہم اس کے گھر والے نہ ہوتے، مہمان ہوتے۔ لڑکے لڑکیوں کی شادیاں کرانے کا شوق بھی جنون کی حد تک پھیلا ہوا ہے۔ درجنوں شادیاں کروا چکی ہیں۔ میں ہر شادی کے بارے میں پیشگوئی کرتا ہوں کہ شادی ناکام ہوگی اور تم توبہ کرلوگی۔ مگر اس بی بی کی خوش قسمتی کہ ہر مرتبہ میری پیشگوئی غلط ثابت ہوتی ہے اور یہ خاتون سرخرو ہوتی ہے۔ اب نوبت اس حد تک جا پہنچی ہے کہ خاتون شادی کا دفتر کھولنے کے درپے ہے۔ ڈرتا ہوں کہ اس کام کی ابتدا کہیں مجھ سے نہ کردے۔ پھر اصغر مہدی کہتے ہیں کہ جوتے انسانی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے بعض حضرات اپنے جوتوں کو آئینے کی مانند چمکا کر کنگھی پٹی کا بندوبست اس کے ذریعہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عذرا جب بھی نیا جوتا خریدتی ہے تو اس کے پھٹ جانے تک نہ اس پر پالش کرتی ہے، نہ کپڑا مارنے کی زحمت۔ کبھی کبھار یہ تردد مجھے یا بچوں کو کرنا پڑتا ہے۔ البتہ محترمہ کا من چاہا میک اپ، بال ترشوانا ہے اور اس حد تک ترشوانا کہ دور سے آتے ہوئے میاں بیوی

کی پہچان محض کپڑوں سے کی جا سکتی ہے۔
اصغر مہدی محترمہ عذرا اصغر کی شخصیت پر اپنا مضمون سمیٹنے سے پہلے ان کے فن پر روشنی ڈالنے کا ذمہ ہم، جو ان کے قارئین ہیں، پہ چھوڑتے ہیں۔
تو خواتین و حضرات! میں محترمہ کے فن پہ بات کرنے سے پہلے یاد دلا دوں کہ تقسیم سے قبل ان کے آباواجداد کا تعلق نستعلیق اردو بولنے والے انڈیا کے شہر مظفر نگر سے تھا۔ مگر عذرا پاکستان آ کر یہاں کے صوبہ پنجاب میں یوں رچی بسیں کہ یہاں کی مٹی کی خوشبو میں گرفتار ہو گئیں۔ ان کے فن کا ایک حصہ ان کی پنجابی زبان میں لکھی گئی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں ان کی کہانیاں حقیقی زندگی کے اس قدر قریب ہیں کہ ان کے کرداروں سے ہماری ملاقات ہونا معمول کی بات ہے۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کی کہانیوں کا محور متوسط طبقہ ہے۔ وہ حقیقی زندگی کے ساتھ یوں جُڑ کر چلنا چاہتی ہیں کہ ان کی کوئی بھی کہانی کم از کم میرے مشاہدے کے مطابق تجریدی یا علامتی ہونے کے زمرے میں نہیں آتی۔ اگر ان کے اسلوب کی بات کی جائے تو وہ اور عصمت چغتائی اس میدان میں جڑواں بہنیں نظر آتی ہیں۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ عصمت چغتائی کی چھاپ کہیں بھی عذرا اصغر کی کہانیوں پر نظر نہیں آتی اور نہ ہی عذرا اصغر کی چھاپ کہیں بھی عصمت چغتائی کی کہانیوں پر نظر آتی ہے۔ تاہم شاید یہ بات ہے کہ تقسیم کے بعد پیش آنے والے واقعات کو ان دونوں نے قریباً قریباً ایک سا محسوس کیا۔
عذرا اصغر کی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عورتوں کی نفسیات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ہم مردوں کی نفسیات کا بھی اچھا ادراک رکھتی ہیں۔ ان کی کہانی 'اٹھارہویں لڑکی' اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ ان کی اس کہانی سے متاثر ہو کر میں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے بعد اس کو اپنی کتاب **Feminine Footprint on Pakistani Literature** میں شامل کیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے پاس طباعت کے مرحلے میں ہے۔
محترمہ عذرا اصغر کا ایک بڑا فخر یہ ہے کہ ادب ان کی زندگی میں اس حد تک رچا بسا ہے کہ ان کے شوہر اصغر مہدی کا شمار بہترین شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی بیٹی شبہ طراز ایک شاعرہ اور ایک نئی جہت رکھنے والی افسانہ نگار خاتون ہیں۔ محترمہ عذرا اصغر کے بیٹے ڈاکٹر امبر تاجور ایک اچھے ادیب ہوتے ہوئے ناول مقاتل ابن الزبن کے مصنف ہیں۔ محترمہ کی نواسی دعا فاطمہ مترجم کی حیثیت سے اردو ادب کا ترجمہ انگریزی میں کر رہی ہیں۔ لیکن ان کی رفتار آہستہ ہے۔ انہیں اس میدان میں تیزی سے آگے بڑھنا ہوگا۔

زندگی راستہ نہیں دیتی
راستہ خود بنانا پڑتا ہے

☆☆☆☆☆

چمن زارِ حمد و نعت (ریاض ندیم نیازی)

ریاض ندیم نیازی پُر گو اور صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ وہ نظم، غزل اور حمد و نعت کہنے میں کمال ہنر رکھتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں موج زن اثر اور ایک جوش و ولولہ اُن کی خاص پہچان ہے اور یہی اجزائے ترکیبی ان کی شاعری کی اساس ہیں۔ نظم، غزل، حمد، نعت اور منقبت وغیرہ تمام شعری اصناف میں ان کی فکری اور فنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ زیرِ نظر ان کی نعتوں اور حمد کا مجموعہ ''چمن زار حمد و نعت'' ہے یہ مجموعہ کلام عبودیت، احترام اور عقیدت و والہانہ وابستگی کا خوب صورت اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے بھرپور شاہ کار ہے۔

افتخار عارف ریاض ندیم نیازی کے اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ریاض ندیم نیاری کو اللہ تعالیٰ نے کثرتِ سے تخلیقی وفور عطا کیا ہے۔ وہ بہت لکھتے ہیں اور بہت جم کر لکھتے ہیں۔ غزلیں، نظمیں، سلام، نعت، منقبت تمام شعری اصناف ان کے قلم کی ثروت مندی کی شہادت دیتی ہیں۔ پیشِ نظر مجموعۂ کلام ''چمن زار حمد و نعت'' کی ایک خوبی یہ ہے کہ اُس میں دونوں صفحوں پر آمنے سامنے ایک پر حمد اور دوسرے پر نعت کی پیش کش کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایک ہی زمین میں ایک ہی ردیف و قافیے میں ذاتِ واجب کی بارگاہِ جلال و عظمت میں نذرانے پیش کیے گئے ہیں اور دوسرے صفحے پر رحمتِ عالمیان آقا حضور، خاتم النبین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف و ثناء کی سعادت حاصل کی گئی ہے اخلاص و نیاز و عقیدت سے کہا گیا یہ کلام بلاشبہ ہمارے ذخیرۂ سعادت میں ایک گراں بہا اضافہ گردانا جائے گا۔ مجھے اس کا یقین ہے۔''

ریاض ندیم نیازی کی حمد و نعت ان کے فنی

فرحت عباس شاہ

کمال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ انھوں نے ان دونوں اصناف میں اپنے شعری فن کا عروج دکھایا ہے۔ حمد و نعت لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ بندگی، عقیدت اور عشق کا معاملہ ہے۔ اس میں کسی کمی کوتاہی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ریاض ندیم نیازی کا یہ مجموعۂ کلام ایک ندرت کا حامل ہے کہ انھوں نے ایک ہی زمین اور قافیہ ردیف میں حمد و نعت تخلیق کی ہے۔ یہ فنی لحاظ سے ایک منفرد اور بے مثال ہے۔ انھوں نے اس تجربہ میں شاہ کار فن پارے تخلیق کیے ہیں:

حمدِ باری تعالیٰ

دوجا نہیں کوئی ، وہی تنہا ہے یقیناً
جو سب کا ہے میرا بھی وہ مولا ہے یقیناً
سچائی کی خواہش ہے تو لَو اُس سے لگاؤ
سچائی کا بس ایک ہی رستہ ہے یقیناً
پوچھو جو کسی سے بھی عقیدے کے علاوہ
ظاہر تو نہیں کچھ پسِ پردہ ہے یقیناً
بڑھتا ہی نہیں ہاتھ غلط سمت جو اکثر
خلوت میں کوئی دیکھنے والا ہے یقیناً
محسوس یہی ہوتا ہے اکثر یہ بہ ہر حال
ہم نے اُسے بن دیکھے ہی دیکھا ہے یقیناً
ممکن ہی نہیں یوں تو ندیم اُس کا تعارف
بس دل میں لگن ہو تو وہ ملتا ہے یقیناً

.....

جس زمین، قافیہ اور ردیف میں حمد ہے اُسی زمین قافیہ اور ردیف میں نعت بھی کہی گئی ہے:

رحمت جہاں رہتی ہے وہ طیبہ ہے یقیناً
جنت جسے کہتے ہیں مدینہ ہے یقیناً
گلیاں وہ مدینے کی، مدینے کے شب و روز
دنیا وہ کوئی اور ہی دنیا ہے یقیناً
جو پہلے پہل جاتا ہے دربارِ نبیؐ پر
سب کچھ اُسے اِک خواب سا لگتا ہے یقیناً
کانٹوں سے تھا لب ریز وہ صحرا وہ بیاباں
جنت سے حسیں اب وہی صحرا ہے یقیناً
لب پر ہے درود اُس کے ندیم آنکھیں ہیں روشن
سر میں کوئی اَن مول سا سودا ہے یقیناً
دنیا میں ندیم اور کوئی بھی نہیں ایسا
جیسا مرے سرکارؐ کا روضہ ہے یقیناً

نعت گوئی اور حمد کہنا قدیم روایت ہے اور اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں ان دونوں اصناف میں انتہائی خوب صورت اور متاثر کن شاعری کی گئی ہے۔ اُردو کے علاوہ دوسری تمام بڑی زبانوں میں بھی حمد و نعت لکھی گئی ہے۔ ریاض ندیم نیازی کا شمار اُن قسمت کے دھنی شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے نعت و حمد کے میدان میں اپنی شعری صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں اظہار کیا ہے۔ ان کا مجموعہ ''چمن زار حمد و نعت'' کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں نام ور شاعر اور کالم نگار عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

''چمن زار حمد و نعت'' عبودیت و عقیدت کا

والہانہ اظہار ہے۔ نعت گوئی ہر کسی کے بس کی بات نہیں یہ ایک مشکل اور نازک کام ہے اس میں احتیاط اور ادب کے تمام تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ ریاض ندیم نیازی نے دونوں کام خوب صورتی سے کیے ہیں۔ رب العالمین اور رحمت العالمین کی حمد و ثناء کو شاعرانہ انداز میں لکھنا ہی ان کے عمدہ فنی محاسن کا ثبوت ہے۔ جس زمین میں انھوں نے حمد کہی اسی زمین میں نعت بھی کہہ کر اپنی انفرادی شناخت قائم کی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔ اس عمدہ کاوش پر وہ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ان کے قلم کو زیادہ توانا کرے (آمین)"

عقیدت کی شاعری ایمان افروزی اور لازوال جذبوں کی عکاس ہوتی ہے۔ ریاض ندیم نیازی کی حمد و نعت ایمان افروز جذبات کی آئینہ دار ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی زمین میں حمد و نعت تخلیق کرنا حبِ الٰہی اور حبِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطا ہے۔ ان کی یہ بے مثال شعری کاوش لازوال ہے۔ حمد و نعت گوئی کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

نعتِ رسولؐ مقبول

مجھے تُو بندہ بنا لے اپنا مری تو بس التجا یہی ہے
اتار دے مرے دل میں کعبہ، مری تو بس التجا یہی ہے

ملوں کسی سے کہیں بھی جاؤں، نگاہ میں دشت ہو کہ دریا
رہے نظر میں ترا ہی جلوہ، مری تو بس التجا یہی ہے

مرے خدا زندگی میں رکھنا مجھے رہِ مستقیم ہی پر
نہ ہو مرا اور کوئی رستہ، مری تو بس التجا یہی ہے

جبیں تو بس تیرے آسرے پر، جو موت آئے تو اے مرے رب
ہو لب پہ کلمہ ترے نبیؐ کا، مری تو بس التجا یہی ہے

لکھے تری حمد میرے مولا تو ہو زمانے میں اُس کا شہرہ
کہ سرخ رُو ہو ندیمؔ خستہ، مری تو بس التجا یہی ہے

رہے نگاہوں میں اُن کا روضہ، مری تو بس التجا یہی ہے
مرا تخیل ہو صرف طیبہ، مری تو بس التجا یہی ہے

مدینے جاؤں وہاں سے آؤں، پلٹ کر پھر سے مدینے جاؤں
یہ آنا جانا رہے ہمیشہ، مری تو بس التجا یہی ہے

مَروں تو ہو اُن کا نام لب پر، جیوں تو بس اُن کے گیت گاؤں
یہی ہو عقبیٰ، یہی ہو دنیا، مری تو بس التجا یہی ہے

بُلائے جائیں جہاں ثنا خواں مرا بھی ہو نام اُن میں شامل
قبول فرمائیں جو مرے آقا، مری تو بس التجا یہی ہے

ندیم جب تک رہوں میں زندہ نہ کم ہو عشقِ نبیؐ کا جذبہ
رہے جنوں مدحتِ نبیؐ کا، مری تو بس التجا یہی ہے

.....

ریاض ندیم نیازی کے مجموعۂ کلام "چمن زار حمد و نعت" کے بارے میں نام ور اہلِ قلم نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور ان کے فنی اور فکری معیار کو زبردست طور پر سراہا ہے اور ایک ہی زمین میں حمد و نعت گوئی کو ایک منفرد ادبی کارنامہ قرار دیتے ہوئے ان کی اس سعی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا

ہے۔بلاشبہ ریاض ندیم نے حمد و نعت کو ایک ہی زمین میں تخلیق کر کے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ اس سے ان کی عقیدت اور جذبۂ ایمانی کا بھرپور طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے ریاض ندیم نیازی کی حمد و نعت اور نعت گوئی کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:

''''چمن زار حمد و نعت'' اور اس کے شاعر ریاض ندیم نیازی کے فکر و فن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غلام آقائے دو جہاںؐ اور خالقِ دو جہاں کی کائناتِ کرم سے اور شعری وسیلے سے اپنے فکر و خیال کی دنیا کا دامن جس والہانہ عقیدت سے بھرنے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ تحسین ہی نہیں بلکہ قابلِ رشک بھی ہے اور یہ بھی بجا ہے کہ یہ کوشش کہیں زور زبردستی سے وجود میں نہیں آتی بلکہ ''یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے'' شاعری کی اس ارفع جہت کی نمائندگی کرنے والے خوش بخت شعراء میں ریاض ندیم نیازی بھی شامل ہیں جو بلاشبہ ایک بڑی خوش بختی کی بات ہے۔''

ریاض ندیم نیازی اپنی حمد میں کہتے ہیں:

حمد باری تعالیٰ

اللہ کی رحمت کے حق دار سوا ہوں گے
جو لوگ زمانے میں راضی بہ رضا ہوں گے
اللہ کے جو بندے مطلوب خدا ہوں گے
ہر زخم کا وہ مرہم، ہر غم کی دوا ہوں گے
بکھرے ہیں جو دنیا میں حکمت ہے یہ سب اس کی
جب حکمِ خدا ہوگا سب رنگ فنا ہوں گے
ہم جوش میں لائیں گے جب جب بھی غضب اس کا
اک حشر سے پہلے بھی سو حشر بپا ہوں گے

نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سُنتے ہیں کہ محشر میں وہ جلوہ نما ہوں گے
دیدار کے ارماں بھی پورے بہ خدا ہوں گے
دنیا کی ہر اک دولت دیکھیں گے حقارت سے
وہ لوگ جو آقاؐ کے کوچے کے گدا ہوں گے
خود رشک ہمیں اپنی قسمت پہ تب آئے گا
ہم جا کے مدینے میں جب نعت سرا ہوں گے
اوروں کو تو بس اپنی اپنی ہی پڑی ہے
محشر میں تو آقاؐ ہی بس راہ نما ہوں گے
احوال سنا دوں گا آقاؐ کو میں سب دل کا
اشکوں کی زباں سے جب الفاظ ادا ہوں گے

.....

ریاض ندیم نیازی کے عشق و عقیدت کی مہک سے آراستہ مجموعۂ کلام جس میں حمد و نعت شامل ہیں ایک تحفہ ہے عاشقانِ رسول صلی علیہ والہ وسلم کے لیے یہ ایک ایسا کمال ہے جس تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ریاض ندیم نیازی کے ہاں جہاں حقیقی و مجازی عشق کے بارے میں واضح ابلاغ کا ہونا ان کی حمدیہ شاعری کی

پختگی کی بڑی دلیل ہے وہاں لفظوں کے بنا یہ آہٹ اور نوری زاویہ خیال کی نمو کی قوت بہار بے خزاں عقیدت مصطفی صلی علیہ وآلہ وسلم بن کر انھیں نعتیہ شاعری میں انفرادی مقام عطا کرتی ہے۔

پروفیسر احسان اکبر نے دوسرے اہلِ قلم کی طرح ریاض ندیم نیازی کے مجموعۂ حمد و نعت کی زبردست طور پر تحسین کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''ریاض ندیم نیازی کی نعتوں کا تازہ مجموعۂ کلام ''چمن زار حمد و نعت'' ایک ندرت لیے ہوئے ہے وہ یہ کہ ایک ہی زمین میں انھوں نے حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سعی کی ہے۔ یہ فنی تجربہ اپنی جگہ مگر یہاں انھوں نے بعض مشہور نعتوں کی زمینوں کو بھی چنا اور وزن، ردیف اور قافیہ کی ذمہ داری ہی نہیں ابلاغ کی ذمہ داری بھی بہ خوبی ادا کی ہے۔ حمد اور نعت دونوں کو ایک ہی پابندی سے نبھاتے ہوئے کیا جو زیادہ فن جوہر کا طالب تھا اس میں انھوں نے کمی نہیں آنے دی۔''

زیرِ نظر مجموعہ حمد و نعت سے پہلے ریاض ندیم نیازی کا مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی زمینوں میں مجموعۂ نعت منظرِ عام پر آچکا ہے۔ یہ اہلِ فکر و نظر اور عاشقانِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہایت ہی مقبول ہوا اور اس کی ہر سطح پر پذیرائی کی گئی۔ زیرِ نظر مجموعۂ حمد و نعت ایمان افروز جذبوں سے لبریز ہے۔

ایک ہی زمین میں لکھی ہوئی حمد و نعت دیکھیے:

حمدِ باری تعالیٰ

جسم و جاں کو روشنی دے، تیری رحمت کا چراغ
خلوت و جلوت میں روشن ہو، اطاعت کا چراغ
میرے دل میں ہے فروزاں، تیری الفت کا چراغ
ہے مری آنکھوں میں روشن، تیری عظمت کا چراغ
تیرے بندے گل جہاں میں، اے خدا روشن رکھیں
علم و عرفاں کا دیا، فہم و فراست کا چراغ
کفر کے جھونکے سے یارب! بجھ نہیں سکتا کبھی
تیری عظمت کا تسلسل، تیری وحدت کا چراغ
تجھ سے اس توفیق کا طالب ہے بس تیرا ندیم
اس کے ایک اک شعر میں روشن ہو مدحت کا چراغ

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آپؐ نے روشن کیا ایسا نبوت کا چراغ
ہر طرف روشن ہُوا حُسنِ عقیدت کا چراغ
ہم سدا روشن رکھیں اور تا ابد روشن رکھیں
عظمتِ کردار کا اور حُسنِ سیرت کا چراغ
بادِ صَرصَر کفر و باطل کی بہت ہی تیز ہے
تا ابد روشن رہے، سرکارؐ اُمت کا چراغ
بس اُنھی کی روشنی میں زندگی گزرے ندیم
فرض کی ہو شمع روشن اور سُنّت کا چراغ

.....

جن اشعار میں جذبے کی صداقت،

عقیدے کا خلوص ایمان کی مہک اور فکر کی پاکیزگی رچی بسی ہو، وہ اشعار حقیقی اور سچی شاعری میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جب کلام کا موضوع حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو تو اس لمحے شاعری اپنے اعلیٰ مقاصد کی تفسیر و تشریح کا فرض پورا کرنے کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتی ہے۔ شاعری کی اس بلند درجہ جہت کی نمائندگی کرنے والے خوش بخت سخن وروں میں ریاض ندیم نیازی بھی شامل ہیں۔

ریاض ندیم نیازی کی حمد و نعت گوئی کے بارے میں سرکردہ اہلِ فکر و نظر، شعرا اور نثر نگاروں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تخلیقات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کے حق دار بھی ہیں۔

ان کے بارے میں بریگیڈیر ذوالفقار باجوہ کہتے ہیں:

''ریاض ندیم نیازی کو نعت گوئی کا وصف اور نبی کریم صلی علیہ وآلہ وسلم کی محبت اللہ سبحانہٗ کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے۔ نہ صرف حمد و نعت بلکہ غزل اور نظم میں بھی کمال فکر کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔ توقع ہے کہ وہ اپنا قلمی سفر جاری رکھیں گے اور اپنے منظوم و منثور خیالات سے بلوچستان کا پرامن اور خوب صورت چہرہ متعارف کراتے رہیں گے''

ریاض ندیم کا زیرِ نظر پاکیزہ کلام لائقِ تحسین و داد ہے انھوں نے فنی لحاظ سے ایک انفرادیت قائم کی ہے اس سے اپنے شاعرانہ فن اور مہارت کی دھاک بٹھادی ہے۔

حمدِ باری تعالیٰ

کرم کو تیرے لالہ لکھ رہا ہوں
تجھے تیرا حوالہ لکھ رہا ہوں
تری وحدت بھی ہے کثرت کی صورت
میں ہر دانے کو مالا لکھ رہا ہوں
وہ دل جس میں ہے دنیا کی محبت
اُسے مکڑی کا جالا لکھ رہا ہوں
ہُوا ہے جب سے احساسِ ندامت
برابر آہ و نالہ لکھ رہا ہوں
نہیں آتا ہے رب کا نام جن پر
میں اُن ہونٹوں پہ تالا لکھ رہا ہوں

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تمھاریؐ نعت آقاؐ لکھ رہا ہوں
میں اپنے دل کا قصّہ لکھ رہا ہوں
جھلکتا ہے تمھارا عکس جس میں
میں اُس قطرے کو دریا لکھ رہا ہوں
تمھاری یاد کے دیپک جلا کر
اندھیروں میں اجالا لکھ رہا ہوں
مُیسّر ہے جنھیں روضے کا منظر
میں ان آنکھوں کو اچھا لکھ رہا ہوں
نظر آقاؐ کی مجھ کو مہر کر دے
میں خود کو ایک ذرّہ لکھ رہا ہوں

☆☆☆☆☆

حلقہ ارباب ذوق اور خالد احمد کی یادیں

یہ 1994 کی بات ہے جب حلقہ ارباب ذوق لاہور پوری طرح اپنے عروج پر تھا، نہ صرف یہ کہ سالانہ انتخابات پوری آب وتاب کے ساتھ ہوتے تھے۔ حلقہ کا ہر رُکن پوری گرم جوشی کے ساتھ اس میں حصہ لیتا تھا اور پھر جب کسی ایک گروپ کے اُمیدوار جیت جاتے تو سالانہ رپورٹ اور حلقہ کے مکمل انتقال اقتدار سے پہلے جیتنے والے امیدواروں کی اپنے حامیوں کے ساتھ آئے روز میٹنگز ہونے لگتیں۔ یہ میٹنگز عام طور پر پاک ٹی ہاؤس، چوپال ناصر باغ، لارنس گارڈن یا پھر پرانی انارکلی کے چائے خانوں پر منعقد ہوتیں۔ جن میں مجلس عاملہ کے انتخاب وحلقہ کے ہفتہ وار اجلاس اور چائے کے اخراجات کے حوالے سے باتیں ہوا کرتیں۔ ان انتخابات کے حوالے سے جو بات سب سے زیادہ دلچسپ ہوتی وہ یہ تھی کہ عام طور پر گہرے اور برسوں کے نظریاتی اور فکری طور پر ایک ساتھ چلنے والے دوست احباب کے مابین بھی اُمیدوار کے معاملے پر اختلاف پیدا ہو جاتا اور کئی بار اگر اس اختلاف کا کھلے بندوں اظہار نہ بھی کیا جاتا تو نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ مخالف اُمیدوار کو ووٹ دے کر اپنے طور پر اس کا ازالہ اور تدارک کر لیا جاتا، ان اقدامات میں سے بعض پر اب بھی عمل کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب وہ صورت حال نہیں رہ گئی ایک تو پچھلے کچھ برسوں کے دوران کئی ایک سینئرز لکھنے والے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور کچھ نئی نسل نے انٹرنیٹ اور فیس بک کے سہارے اپنے آپ کو اس قدر خود کفیل اور شہرت کا حامل شاعر ادیب سمجھ لیا کہ انھوں نے حلقوں، رسائل وجرائد اور شعرا و ادبا کی ''تلامذہ گہی'' میں آنے سے اپنے آپ کو ماورا جان لیا۔

زاہد حسن

یہاں میں انھی برسوں کے دوران کچھ عجیب و غریب تجربات کا حصہ بنا، جن میں سے بعض بے حد مثبت اور بے حد اہمیت کے حامل تھے جبکہ بعض نے میری اپنی شخصیت پر بہت مُضر اور منفی اثرات مرتب کیے۔ ان تجربات اور ان تجربات سے اخذ شدہ مشاہدات کے ساتھ ساتھ بعض شخصیات نے بھی مجھے اور میری نسل کے بعض دیگر جو اس وقت حقیقت یہ ہے کہ نئے لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے ان سب کو اپنی ادبی سمتیں متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مری صورت یہ تھی کہ میں نے انھی دنوں میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور جوائن کیا تھا اور وہاں ہوتے ہوئے کسی اردو حلقہ میں جائنٹ سیکرٹری کے طور پر منتخب ہونے کے بعد کس قسم کے حالات اور معاملات سے مجھے نمٹنا پڑا۔ میں ہی جانتا ہوں یہ وقت ان تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔ اس سب کو کسی اور موقع پر کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں اور یہاں تذکرہ کرتے ہیں اس شخصیت کا جو حلقہ میں جائنٹ سیکرٹری اور سیکرٹری کے طور پر الیکشن لڑتے ہوئے ہر بار میری مخالف ٹیم کا ساتھ دیتے رہے لیکن لاہور میں کتنی ہی شامیں اور کتنی ہی راتیں ان کی نرم گرم محفل میں گزریں۔ میرے نزدیک پچھلی چار دہائیوں تک جو اردو شاعری خاص طور پر اردو غزل کی اہم تر اور معتبر آواز تھے، یقینی طور پر جو آج بھی اردو غزل کی توانا آواز ہیں جو آنے والے کتنے ہی برسوں تک ایک منفرد اور یگانہ روزگار شاعر کے طور پر جانے پہچانے جاتے رہیں گے، میری مراد خالد احمد سے ہے۔

خالد احمد جو 5 جون 1943 کو لکھنو میں پیدا ہوئے اور 19 مارچ 2013 کو لاہور میں وفات پا گئے۔ اگرچہ وہ مشاعروں اور دیگر ادبی تقریبات میں شرکت کے لیے پاکستان سے باہر کئی بار گئے لیکن وہ ہمیشہ جلد سے جلد لاہور پلٹنے کے لیے بے قرار رہے کہ یہاں کی محفلیں ان کے لیے سانس اور روحانی غذا کی حیثیت رکھتی تھیں، پہلی بار جب میں حلقہ میں جائنٹ سیکرٹری کے طور پر منتخب ہوا تو اعجاز رضوی بطور سیکرٹری امیدوار تھے، اسرار زیدی (مرحوم) ہمارے مخالف امیدواروں اشفاق رشید اور طاہر ناصر علی کو سپورٹ کر رہے تھے۔ اسرار زیدی کی وجہ سے خالد احمد بھی ہمارے مخالف امیدوار کے ساتھ تھے، احمد ندیم قاسمی اور کئی دیگر احباب ہماری سپورٹ کر رہے تھے۔ احمد ندیم قاسمی حلقہ ارباب ذوق کے رکن نہیں تھے تاہم وہ اس کے باوجود ہر رکن حلقہ کو ہمیں ووٹ ڈالنے کا کہتے، ایسے ہی 2005-6 میں جب میں حلقہ کے سیکرٹری کے طور پر منتخب ہوا تو خالد احمد، میرے مخالف امیدواروں ارشد شاہین اور کنور خاں کو سپورٹ کر رہے تھے لیکن جب حلقے کے انتخابات کا نتیجہ سنایا جانے لگا تو الیکشن اتنے زور و شور سے ہوا تھا کہ کئی بار تو میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوئی لیکن آخر کار میں

اور محمد عامر رانا منتخب ہو گئے، جون ہی کے گرم دن تھے اور خالد احمد نے اتنی زوردار کمپین کی تھی کہ رزلٹ آنے کے بعد وہ پاک ٹی ہاؤس کے سامنے واقع لوہے کی ریلنگ پر تقریباً ادھ موئے سے گر پڑے تھے، میں فوراً ان کے پاس گیا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ آپ میری جیت کو بھی اپنی جیت ہی سمجھیں، بعد میں مجھے احمد ندیم قاسمی صاحب کا محبت اور شفقت سے بھرا کامیابی کی مبارکباد کا خط بھی ملا۔ اس کے بعد اور اس سے پہلے لاہور میں چائنیز لنچ ہوم، پرانی انارکلی، چوپال، الفضل ریسٹورنٹ لکشمی چوک، اور پھر آخر میں ادبی بیٹھک، الحمرا مال روڈ، لاہور ہمیشہ یہ سوچ کر ان سے ملنے، اُن کی باتیں سُنے اور ان لوگوں سے ملنے کے لیے چل پڑا، کہ ضرور کوئی علمی بات سننے کو ملے گی۔ ادب میں نووارد کسی نوجوان سے ملاقات ہو گئی جس سے خالد احمد فرمائش کر کے شاعری سن رہے ہوں گے، یا پھر کوئی لطیفہ یا واقعہ سنایا جا رہا ہو گا۔ کوئی کسی بے ساختہ لیکن بامعنی اور دانش بھرا جملہ کہے گا جس کی تاثیر اور تازگی کئی دنوں تک برقرار رہے گی۔ یہ کہنا چاہیے کہ خالد احمد اور اس کے احباب کی جانب سے برپا کی جانے والی محفلیں ہی آخری محفلیں تھیں جو پچھلے کچھ برسوں کے دوران لاہور کی میں برپا رہیں اور پھر ٹھیک آٹھ برس پہلے وہ وفات پا گئے اور ان کی وفات کے ساتھ ہی سب محفلیں اجڑ گئیں ان کی وفات سے پہلے ان کے احباب نے ان کا تازہ شعری مجموعہ 'نم گرفتہ' شائع کیا اور قذافی سٹیڈیم فیروز پور روڈ، اس کی تقریب کا اہتمام کیا میں محفل میں شریک ہوا تقریب جاری تھی۔ خالد احمد نے مجھے مسکرا کر دیکھا، ایک ایسی مسکراہٹ کو آج بھی میرے ذہن و دل میں اُسی طرح تر و تازہ اور شاد آباد ہے، وہ ایک شگفتہ اور شاد آباد شخصیت تھے، اگرچہ ان کی محفل میں بیٹھتے ہوئے ہر انسان کو بہت مستعدی کے ساتھ بیٹھنا پڑتا تھا کسی وقت بھی کوئی جملہ اُن کی طرف سے آ سکتا تھا۔ جہاں تک ان کی شاعری کی بات ہے میرے نزدیک وہ اپنے عہد کے دو چار منفرد اور عمدہ ترین شعرا میں سے ایک تھے، جو شعر کی مکمل ریاضت کے ساتھ ان کے حقیقی اور سنجیدہ مفہوم کے ساتھ کہتے تھے ان کے مشہور شعروں کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ حقیقت یہ ہے کہ ابھی ناقدینِ فن کی نگاہ ان کی شاعری پر اس طرح سے پڑی ہی نہیں، اور نہ ہی ان کی شاعری کے حوالے سے پرکھ کا وہ معیار قائم ہو سکا ہے جو کہ ہونا چاہیے۔ بہر حال وقت آئے گا جب عام و خاص ان کی شاعری کی طرف رجوع کریں گے اور ان کی حقیقی حیثیت کا تعین کر پائیں گے۔

قمقموں کی طرح قہقہے جل بجھے
میز پر چائے کی پیالیاں رہ گئیں

☆☆☆☆☆

مابعد جدیدیت اور چند معاصر متغزلین __ اکرم کنجاہی

مابعد جدیدیت اردو ادب میں ایک ٹیڑھا مسئلہ ہے تاہم اس موضوع کی بدولت تنقیدی دبستانوں میں خوب گہما گہمی رہی۔ نئی تنقید میں مابعد جدیدیت پہلا اور پس ساختیات دوسرا موضوع ہے جس پر بھرپور توجہ دی گئی۔ لیکن تا حال مابعد جدیدیت کی، افسانے اور تنقید کی طرح، کوئی حتمی تعریف بجز تشریحات سامنے نہیں آئی کہ جس کے بعد اسے جدیدیت سے الگ کر کے نئے ادب سے اصلاح کی صورت وضع کی جا سکے۔

اردو میں مابعد جدیدیت کے مباحث کا آغاز 1990 کی دہائی میں ہوا۔ مغرب میں 1960 میں مابعد جدیدیت کا آغاز ژاک دریدہ کے ایک مضمون سے ہوا جسے نقطہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ جس کے مطابق مابعد جدیدیت مرکزیت اور ہر طرح کی پابندی کے خلاف ہے اور تخلیقی اظہار کی آزادی پر مُصر ہے۔

مابعد جدیدیت کے سب سے بڑے شارح ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے مضمون ''مابعد جدیدیت عالمی تناظر میں'' لکھتے ہیں کہ' مابعد جدیدیت کسی بھی نظریئے کو حتمی اور مطلق نہیں مانتی۔ یہ سرے سے نظریہ دینے کے خلاف ہے۔ ہر نظریہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے استبدادی ہوتا ہے اس لیے تخلیقیت اور آزادی کے منافی ہے۔''

''کسی بھی نظام کی کسوٹی حقوق انسانی اور شخصی آزادی ہے، یہ نہیں تو سیاسی آزادی فریبِ نظر ہے۔''

عظیم بیانیے کا زمانہ نہیں رہا۔ عظیم بیانیے ختم ہو گئے یا زیرِ زمین چلے گئے ہیں۔ مابعد جدیدیت ہر طرح کی کلیت پسندی اور فارمولا سازی اور ضابطہ بندی کے خلاف ہے اور اس کے مقابلے میں مخصوص اور مقامی، نیز کھلے ڈھلے، فطری، بے محابہ اور آزادانہ اظہار و عمل پر اصرار کرتی ہے۔''

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہ بھی بتایا کہ مابعد جدیدیت ایک ادبی تنقیدی تھیوری سے زیادہ ایک صورت حال ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کون سی صورت حال؟ جب یہ تھیوری ہی مغرب کی ہے تو ظاہر ہے کہ

اعجاز روشن

صورت حال بھی وہیں کی ہے جو برق رفتاری سے تغیر پزیر ہے۔ پھر اس کا اطلاق اردو معاشرے پر کیسے ہوسکتا ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کی تشکیل ہر سماج کے لحاظ سے مختلف ہوگی۔ گویا اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تھیوریاں ہمارے یہاں مجرد بحث پر ہی اکتفا کرتی ہیں۔

''مابعد جدیدیت اور چند معاصر متزلین'' جناب اکرم کنجاہی کی تازہ تصنیف ہے مگر یہاں مابعد جدیدیت برائے بحث والا معاملہ نہیں ہے۔ دم غنیمت ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں ایک معتدل رویہ کو بروئے کار لایا اور بیچ کی ایک ایسی راہ نکالی جو سب کے لیے قابل قبول ہو، لکھتے ہیں:

''ہم عالمی مابعد جدیدیت کی تھیوری کی اُردو میں بغیر ردوبدل کے قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہر زبان کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے۔ ہر معاشرت کا اپنا ایک تمدن ہوتا ہے اور مابعد جدیدیت کی تو بنا ہی تہذیب و ثقافت پر رکھی گئی ہے لہٰذا ضروری نہیں کہ کسی دوسری تہذیب کے ذہن و فکری رجحانات و ہمارے تخلیق کار بھی بلا تردد غور و فکر پزیرائی بخشیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمارا ادیب و شاعر اب کسی ایک تھیوری یا تصور کو اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیتا، مگر بہت سے مذہبی و تہذیبی معاملات میں اس کے اعتقادات کی بنیاد مضبوط ہے۔''

یہ ایک خوبصورت فکر کی معتدل صورت ہے، جس کی طرف اکرم کنجاہی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ گویا جس سماجی صورت حال میں ہم رہتے بستے ہیں غور و فکر بھی اسی پر ہونا چاہی تاکہ تحریر و ادب میں دیانتداریا ور اخلاص کی مثبت اقدار فروغ پائیں۔ کوئی بھی مغربی تھیوری یکدم معاشرے میں نہ نفوذ کرتی ہے اور نہ ہی اس کا اطلاق اس کا دروبست جانے بغیر ممکن ہے۔ مابعد جدیدیت کا ایک قدم جدیدیت کی کوٹھڑی کے اندر ہے اور دوسرا دہلیز سے باہر ہے۔ آگے جو صورت حال پیدا ہوگی جس کی طرف ڈاکٹر نارنگ نے اشارہ کیا ہے، اس میں ابھی کافی وقت درکار ہے۔ فی الحال تو ادب اور زندگی کا مضبوط بنیادوں پر رشتہ قائم ہے۔

اکرم کنجاہی کی پانچ کتب حالیہ تین برسوں میں شائع ہوئی جو تنقید و تحقیق سے متعلق ہیں۔ جب ایک فرد واحد ایک اکیڈمی کا کام کرتا ہے تو حیرت ہوتی ہے اور اس پر یقین پختہ ہوتا ہے کہ:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں۔ بلاشبہ، یہ کتاب بھی اکرم کنجاہی کی دیگر کتب کی طرح فکری ادب میں قابل صد تحسین اضافہ ہے۔ 256 صفحات کی یہ کتاب ''رنگِ ادب پبلی کیشن کراچی'' نے شائع کی ہے جس کی قیمت 800 روپے رکھی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

تمام نام ترے نام نے تراشے ہیں

تمام نام ترے نام تراشے ہیں
دلوں کی تال ، سبک جھانجنوں کی جھنکاریں
تمام سحر ، ترے اِسم کے تماشے ہیں

کنارِ آبِ رواں اک درخت کے مانند
کھڑا ہُوا ہُوں خطاکار صادقوں کی طرح
مثالِ عدسۂ چشمِ حیا بچا مجھ کو

مرے خُدا ! تری لاٹھی مری تسلّی ہے
مرے خُدا ! مرے آہنگ پر توجّہ دے
خیالِ مرگ کے پھاٹک سے اَب اُٹھا مجھ کو

چیخ اُٹھے مرے لب خشک ٹھیکروں کی طرح
مرے خدا! کوئی ایذا طلب نہ جان مجھے
مرے خدا ! مرے ناحق لہو کی پُرسش کر

مرے خُدا ! مری قوّت، مری سپر تُو ہے
اب اَن سُنی نہ کر اِن بے ریا لبوں کی دُعا
کہ چُور چُور ہُوں میں آج، جامِ گِل کی طرح

مرے خُدا ! مجھے یُوں اپنے قہر میں نہ جھڑک
کہ میری روح ، مری ہڈیوں میں جلنے لگے
صداقتوں کے مطابق مری عدالت کر

ہر ایک پل کسی بے کس کی گھات میں ہیں عدو
بَدی کے تیر ستم کے کمین گاہوں سے
تمام راست دلوں پر چلائے جاتے ہیں

عدو کا ظلم عدو کھوپڑی پہ نازل کر
کہ تیرے ہاتھ میں ہے تیرے صادقوں کی نجات
وہ جن کے ہاتھ لگی صرف مُشتِ خاک حیات

مرے خُدا ! مرے پروردگار! قہر میں اُٹھ
تری زمیں پہ فقط پاجیوں کی قدر ہو کیوں
مرے جمیل خدا ! حُسن کی وکالت کر

خالد احمد

نظمانے

امجد اسلام امجد

عزت اور محبت کے دن
ملنے والی شہرت سے تو
گمنامی ہی بہتر ہے

مجنوں اپنی لیلیٰ کو،
ماں بچے کو بھول گئی
کیا یہ روزِ محشر ہے!

جو لیا تھا اپنے پُرکھوں نے
ہم لاکھ کریں انکار مگر
وہ قرض ہمارے اوپر ہے

سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے
منزل تک جو ساتھ چلے
رستے کی وہ ٹھوکر ہے

دور تلک ویرانہ ہے
کیسے رستہ بتلائے
دل تو آپ مسافر ہے

بس کرونا

ذرا سے وائرس نے
دوڑ لگوادی جہاں بھر کی
عزیزوں دوستوں کے درمیاں بھی
فاصلے دیوار کر ڈالے
دنوں میں
شہر بَن،
گھر غار کر ڈالے
جہازوں کو زمیں بستہ کیا ایسے
پرندے پَر کٹے جیسے
ٹرینیں جام،
صحبتیں شام کر ڈالیں
لگائے دفتروں، تعلیم گاہوں،
معبدوں پر خوف کے تالے
بھرے عشرت کدے، شاپنگ پلازے
کر دیے ویران
اور سنسان
سارے کوچہ و بازار کر ڈالے
دلوں پر دہشتوں کے
کیسے کاری وار کر ڈالے
ہر اک احساس پردے پر
نمایاں موت کے آثار کر ڈالے
بدل ڈالے بیانی زاویے
سب فلسفے بیکار کر ڈالے

جلیل عالی

عمران خان

یہ اک ذرّہ جو چمکا ہے، ستارہ ہو بھی سکتا ہے
ہمارے روزِ روشن کا اشارہ ہو بھی سکتا ہے

یہ ممکن ہے ہمیں موجِ بلا کے پار لے جائے
یہ اک طوفاں جو اُٹھا ہے کنارا ہو بھی سکتا ہے

عجب کیا ڈوبنے والے کنارے پر پہنچ جائیں
جسے تِنکا سمجھتے ہیں، سہارا ہو بھی سکتا ہے

کبھی ہم نے جو سب کو ورطۂ حیرت میں ڈالا تھا
وہی اک معجزہ اب کے دوبارہ ہو بھی سکتا ہے

وہ منظر روشنی کا، جو شبِ ظلمت سے پھوٹا تھا
جبینِ وقت سے پھر آشکارا ہو بھی سکتا ہے

چمک کر اک کرن نے راستہ ہم کو دکھایا تھا
ہمارا سامنا اُس سے دوبارہ ہو بھی سکتا ہے

وہ اک خوابِ حسیں جو جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا
اگر ہم جاگ اُٹھیں، تو ہمارا ہو بھی سکتا ہے

جمیل یوسف

پیپل

ملی ہے زندگی ہم کو
مگر پوری نہیں
آدھی ادھوری سی
مرن جوگی
کہ جیسے گھر کے پرنالے میں پیپل کا کوئی
پودا نکل آئے
وہ پودا جس کا کوئی کل نہیں ہوتا
جو پیپل ہو کے بھی پیپل نہیں ہوتا
تناور پیڑ بننا جس کا
خوابوں میں ہی ممکن ہے

چلو ہم خواب ہی دیکھیں
کسی روشن زمانے کے
کسی خوشحال دنیا کے
جہاں غربت نہ ہو
نفرت نہ ہو
مذہب نہ ہو
انسانیت ہو
سب برابر ہوں،
ابھی اعمال پر تلوار چلتی ہے
ابھی خوابوں پہ پابندی نہیں ہے

شاہنواز زیدی

تمھیں آزاد کرتی ہوں

نہ کوئی عذر ڈھونڈو
اور نہ اب نظریں چراؤ تم
مجھے معلوم ہے
میں سب سمجھتی ہوں
تمھارے عہدِ الفت سے تمھیں آزاد کرتی ہوں
اب ایسا ہے کہ پتھر کا زمانہ پھر سے لوٹ آیا
وہی قانون جنگل کا، جبلت کا غلام انساں
فرازِ عرش سے پاتال تک کا ہے سفر یعنی
فراق و ہجر کے موسم ہوئے پارینہ قصے اب
بکثرت ہیں میسر اب تو معشوقانِ شیریں لب
میں ہوں حیرت زدہ اب تک
وہ کیسے لوگ تھے آخر
لہو سے کر گئے رنگین جو الفت کے قصوں کو
عجب ہی رہ نکالی تھی
وفا کی رسم ڈالی تھی
میں قصہ گو ابھی تک داستانوں ہی میں رہتی ہوں
وہی رسمیں نبھاتی ہوں، وہی دکھ درد سہتی ہوں
مگر میں عہدِ حاضر کے رویّوں سے بھی واقف ہوں
سو کوئی عذر مت ڈھونڈو
نہ اب نظریں چراؤ تم
مجھے معلوم ہے، میں سب سمجھتی ہوں
تمھارے عہدِ اُلفت سے تمھیں آزاد کرتی ہوں

فرحت پروین

شہرِ ملتاں، الوداع!

(ریٹائرمنٹ کے بعد شہرِ ملتان سے واپسی پر)

ہو چکی سیرِ گلستاں ، الوداع
اے ہَوائے شہرِ ملتاں ، الوداع
بجھ رہا ہے بزمِ صحبت کا چراغ
دل ہُوا جاتا ہے ویراں ، الوداع
آنکھ بھر آئی ہے رخصت کی گھڑی
دل زدہ ، با چشمِ گریاں ، الوداع
تجھ کو پہنچے ایک شاعر کا سلام
کہہ رہا ہے اِک غزلخواں، الوداع
یاد آئے گی تری اِک اِک لو
اے مری بزمِ چراغاں ، الوداع
الفراق اے اولیاؒ کی سرزمیں
منزلِ راہِ درخشاں ، الوداع

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برے دنوں کے دکھی ساعتوں کے ساتھی ہیں
یہ لوگ مرے غارت گروں کے ساتھی ہیں!

چاند سے جھگڑا

میں جس خطے میں رہتی ہوں
وہ خطہ ایسا خطہ ہے
جہاں چاند سے جھگڑا رہتا ہے!

اس نقش ہلالی کا شکوہ
نیزے پہ ہمیشہ الکا ہے
کیوں ماہ مبارک میں جھگڑا؟
باقی عرصوں میں پوچھ نہیں
نہ نظریں ہیں، نہ دوربینیں
نہ کوئی گروہ نہ خردبینیں
جب گیارہ مہینے میرے لئے
عشاق اکیلے جاگتے ہیں
پھر ایک مہینہ ایسا کیوں
جب عاقل فاضل اہل ہنر
افلاک پہ آنکھیں پھیلائے
بھاری آلات کی اوٹ لیے
مجھے فرداً فرداً ڈھونڈتے ہیں
پھر رات گئے اس پرچی پر
میں انکول ہی جاتا ہوں
میں جس خطے میں رہتی ہوں
وہ خطہ ایسا خطہ ہے
جہاں چاند سے جھگڑا رہتا ہے

فرخندہ شمیم

خالی پن

کہیں سے اچانک
مرے دل سے شاید
صدا آ رہی تھی
کہ اس خالی پن کو ٹھکانے لگاؤں
یہاں درزوں میں درد کی قاشیں بھر دوں
ادھر کونے میں صرف خوابوں کی گٹھڑی سجا دوں
کسی چارپائی کے نیچے
شکستہ امیدوں کے ریزے چھپا دوں
دریچے سے اوپر کی دیوار بھولی ہوئی ایک تصویر کی منتظر ہے
وہ تصویر اوراقِ خستہ میں شامل کہیں کھو گئی ہے
وہاں اپنی آنکھیں لگاؤں
وہ محراب کے عین نیچے
کسی یاد کا ایک ٹوٹا دیا جل رہا ہے
اسے خیر جلنا تو کیا ہے
دھواں ہی دھواں دے رہا ہے
اسے اب بجھا دوں
کھلی کھڑکیاں بند کر کے
اندھیرے کی ٹھنڈک بچھا دوں
لو ہر شے اب اپنی جگہ کی مکیں ہے
مگر خالی پن تو!
وہیں کا وہیں ہے

طالب انصاری

''بحرِ بے کراں''

عشق الہام ہے، کرامت ہے
عشق ہادی ہے، عشق رہبر ہے

عشق اک مسندِ حقیقت ہے
اس کا چرچا، جہاں میں گھر گھر ہے

عشق سوزِ درونِ دل کی دوا
سچ کہوں تو جہان میں اس کی

عشق فردوس، عشق جنت ہے
ذات اعلیٰ ہے، ذات برتر ہے

عشق بن ہے جہان، لق و دق
عشق ہی کائنات کا تحفہ

زندگی میں ہے عشق سے رونق
عشق ہی شش جہات کا تحفہ

عشق دنیا میں گر نہیں ہوتا
عقل والے کہیں کہ کیا ہے عشق؟

رنگِ عالم نہ یوں حسیں ہوتا
مرضِ عشق کی دوا ہے عشق

جھگڑے ہوتے نہ زن، زمیں، زر کے
میر، کیا خوب کہہ گیا شوکت

عشق دل میں اگر مکیں ہوتا
''سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق''

عشق کرتا ہے رام، پتھر دل
اندروں، سینۂ تپاں ہے، عشق

عشق آساں کرے ہے ہر مشکل
الغرض! بحرِ بے کراں ہے عشق

زندگانی، فضول ہے بن عشق
یہ جوانی، فضول ہے بن عشق

جاودانی ہیں عشق کے قصے
ہر کہانی فضول ہے بن عشق

عشق مجنوں ہے، عشق لیلیٰ ہے
عشق ہی نور ہے، سویرا ہے

شوکت محمود شوکت

دل کی بات

عشق ایسا شدید جذبہ ہے

جو حدوں کے عبُور کرنے پر

کرتا ہے آدمی کو یوں مجبور

کہ وہ منزل کو پانے کی خاطر

کرتا رہتا ہے روز و شب پیہم

خود کو مر مٹنے کے لیے تیار

عشق لے جاتا ہے وہاں کہ جہاں

عقل اور دل پہنچ نہیں سکتے

عشق میں اُس کو اپنی ساتھی کی

ساری ہی باتیں اچھی لگتی ہیں

معرکے سر جو کرنے ہوں تو پھر

عشق ہی صرف کام آتا ہے

یہ وہ جذبہ ہے جس سے ''دل کی بات''

اک نظر سے بیان ہوتی ہے

طاہر ناصر علی

اداسی کے رنگ [نثری نظم]

خیال کی چادر پر

اداس جذبوں کے دھاگے سے کاڑھی نظم

نگاہوں کے گوشے بھگو دیتی ہے

احساس کی چبھن پوروں پر محسوس کر کے

روح بھی ژولیدہ لمحوں کے لمس سے افسردہ ہو جاتی ہے

تخئیل کے کاغذ پر آنسوؤں کے نشان

ستاروں کی مانند دمکتے ہیں

من کے اندھیرے آنگن میں اجالا جاگنے لگتا ہے

محبت خوابیدہ آنکھوں سے یادوں کے کینوس پر اداسی کے پھول کاڑھتی ہے

فضا میں گھمبیر تنہائی کی چاپ اور

خامشی کی دستک کا الوہی فسوں بکھرا ہے

"اداسی کے رنگ انمٹ ہوتے ہیں"

نائیلہ راٹھور

اگلا جنم [نثری نظم]

روایتوں کی قید میں
آنکھ کھلی
نہ دل اپنے بس میں تھا
نہ جسم پہ کوئی دسترس
خواب
تعبیروں کے تعاقب میں
جنگل جنگل
اُلجھے رہے
خواہشیں
موسموں کی طرح
بیت گئیں
اور زندگی
اگلے جنم پر
تکیہ کیے گزر گئی

طلعت شبیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوچیں تو ہوائیں تہِ اشجار رواں ہیں
دیکھیں تو سرِ شاخِ نظر، برگ نہ بر ہے

سپنا کوئی دیکھنے کی چیز ہے

[نثری نظم]

ایسے شہر میں کیا رہنا
جہاں گونگی گولائیاں
مجسموں کی راہ تکتی ہوں
قلعے اور مقبرے
سود پر فخر فراہم کریں
جہاں گھاس تک
تلواروں سے کاٹی جاتی ہو
ایسے دیس میں کیا بسنا
''جہاں فن کا موتی
سیپ کی کوکھ میں مرجائے''
بس گنتی کا راج ہو
ہوٹروں سے خفقان اچھلے
نخوت سے گھومتی لال پیلی بتی
جان نکالے
گلیوں کی پہچان
کلاکاروں سے نہ ہو
رنگوں اور دھنوں کو جلاوطن کر کے
کیا خدا تک پہنچا جا سکتا ہے؟

میدان زمین کا ادنا درجہ ٹھیرے
غلامی کا غلاف انھیں سدا راس آیا
زندگی ہمکتی ہے کوہساروں میں
وادی وہی
جہاں پھولوں کی مہکار رقص کرے
نگری وہی
جس کے پہلو میں اک شفاف دریا بہتا ہو
اس کے سینے پہ مچلتی سنہری لہریں
پریم کہانی کا فسوں پھونکیں
اور
افسانے کے کردار
پیار پکھیرو ہوں
نہ کوئی شہزادہ
نہ کوئی شہزادی
کہ
رومان اور حرم کی آبادکاری
دو متضاد قطب ہیں

جمیل احمد عدیل

الفاظ کے منتر [نثری نظم]

دیکھتے دیکھتے
بستر پر سانپ بن جاتا ہے
درخت پر بیٹھا
طوطا غائب ہو جاتا ہے
خواب میں
لڑکی کے بال جل جاتے ہیں
آسمان سے
پتھروں کی بارش ہونے لگتی ہے
زمین وجد میں گنگنانے لگتی ہے

دیکھتے دیکھتے
ہاتھ لمبے ہو جاتے ہیں
آنکھیں نکتوں میں دھنس جاتی ہیں
لفظ رنگوں کے برش سے چپک جاتے ہیں
گھر دیواروں کے تکلف سے بھر جاتے ہیں

دیکھتے دیکھتے
خواب کے معنی نکل آتے ہیں
جگنوؤں سے اندھیرے ٹپکتے ہیں
دریا سے ریت کی بدبو آتی ہے
محبت کی کہانی
بھول جاتی ہے

امجد بابر

الاؤ

دھند کی اوڑھنی کو سرکاتی
دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی
گاہے رکتی ہے، گاہے چلتی ہے
رات اپنے کسی سفر پر ہے
سوکھی، گیلی سلگتی سانسوں سے
ناگہاں ایک شعلہ اٹھتا ہے
جیسے وہ شب کے شامیانے میں
کوئی گہرا شگاف ڈالے گا
شعلگی --- نارسائی کی سوتن
بجھتے بجھتے بھڑکنے لگتی ہے
سرد مہری کی جامنی چادر
خواب کے تن پہ کسمساتی ہے
آرزو --- بانسری کی مدھم لے
دل پہ چپکے سے پانو دھرتی ہے
دفعتاً دھیان کے جھروکے سے
ایک کوندا لپک دکھاتا ہے
کاش یہ شبنمی خماری آنچ
دُھند کی آنکھ نور سے بھر دے
رات کی عرفیت بدل جائے
پھول جھڑنے لگیں ستاروں سے
آگ ٹپکے رگِ محبت سے
وقفے وقفے سے لکڑیاں ڈالیں
اس الاؤ میں آشنائی کی
اور پھر دل کی آنکھ سے دونوں
آج اک دوسرے کا چہرہ پڑھیں

شاذیہ مفتی

''قریۂ چھپ'' کا ایک درویش

سنا ہے ''قریۂ چھپ'' میں ہے اک درویش
محبت کے سدا جو گیت ہی گائے
یقیں بن کر کھڑا ہے بے یقینی میں
جو مفہومِ وفا پتھر کو سمجھائے

محبت سے بھرے ہیں لفظ سارے ہی
ستاروں سے ہیں روشن تر سبھی افکار
بہت مدت گزرنے پر ابھی تک ہیں
بصیرت کی وہ تصویریں سرِ دیوار

ہے روشن تر فلک پر آفتاب شعر
مثالِ ماہ ہے ظلمت میں راتوں کی
تو مرشد ہے سراپا، پیر لفظوں کا
تری بیعت میں ہے گٹھڑی خزانوں کی

رہے شوکت کی شوکت بزمِ ہستی میں
سدا آباد ہو شہرِ سخن اُس کا
وہ پورا ہو جو اُس کا خواب ہے دل میں
پھلا پھولا رہے صدیوں چمن اُس کا

آفتاب محمود شمس

نثری نظم [افتخار شفیع کے لیے]

افتخار شفیع! میری باتوں سے
میرے اجداد کے لہجے کی خوشبو آتی ہے
میں نے خواہشوں کا احترام کیا ہے
کبھی بغاوت نہیں کی

(۳)

یہ بھی ٹھیک ہے افتخار شفیع!
میں تیرے معیار سے کم تر ہوں
تو چاندنی کا مبلغ
میں چاندنی پر فریفتہ رہتا ہوں
جلا کے چراغ جگنوؤں کو بلاتا ہوں
پھر بھی
اک بار خواب خوش خرام کی نظر سے دیکھ تو سہی
کبھی آزاد پنچھیوں کی سن تو سہی

(۱)

میں جب بھی سبز موسم کی بات کرتا ہوں
تم ایک پتھر پر چراغ روشن کرتے ہوئے
کسی معبد کے دروازے تک لے جاتے ہو
میں شبنمی چاندی کا ذکر کرتا ہوں
تم اسباب وفا کی رگوں میں دوڑتے لمس
کی حکایت سنا کر
لذت زخم کے لہجے میں تعبیر زنداں کی کہانی سناتے ہو
کبھی ولایت جنوں پر درود
کبھی چاندنی میں ڈوبی خوشبو پر سلام پڑھتے ہو
انا تکمیل خواب من الصاحبین کی داستان بھی
سناتے ہو
مجھے بہت رلاتے ہو

(۲)

میں کہیں بھی رہتا
میری سوچوں میں سبز موسم کے چشموں
کی ٹھنڈک رہتی
میں خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے
کالی چٹانوں سے باتیں کرتے ہوئے
صحرا میں محو سفر رہتا ہوں

منصف ہاشمی

اندیشہ

سنو، اے زندگی!

ٹھہرو،

وہ مجھ سے ملنے آیا ہے

مرے اندر بہت سی ان کہی پیاسی

تمناؤں نے پھر سے سر اٹھایا ہے

کہیں یادوں کے ساحل پر پڑی کچھ

سیپیوں کو میں نے کتنے پیار سے

چاہت کی ڈوری میں پرویا ہے

یہ ڈوری ٹوٹ نہ جائے

وہ مجھ سے روٹھ نہ جائے

مرے ہاتھوں سے دامن عشق کا پھر

چھوٹ نہ جائے

دھنک رنگی فضاؤں سے اترتی

دل دریچے پر صدا دیتی وہی مانوس سی

آواز پہ دل کھنچتا جاتا ہے

کہیں وہ لوٹ نہ جائے

یہ سپنا ٹوٹ نہ جائے

سنو، اے زندگی! ٹھہرو

وہ مجھ سے ملنے آیا ہے

فرحانہ عنبر

خطوط

آصف ثاقب

مدیر محترم عمران منظور

السلام علیکم!

اب کے ’بیاض‘ نے بہت راہ دکھائی دیر سے آیا تو دیدہ و دل فرش راہ!!!

رسالے کے انتظار کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے آپ کو ”زندہ باد“

عظیم فنکار یوسف خان (دلیپ کمار) کے سانحہ ارتحال نے از حد غم زدہ کر دیا ہے۔ ایک سانس میں زوردار مکالمے بولنے والا سانس کے آزار میں مبتلا رہا اور اسی میں دم مسافر ہو گیا۔ دلیپ کمار کی اداکاری کا میں شیدائی تھا (مرحوم) کی جو فلم ایبٹ آباد میں آتی میں اُسے تین چار بار ضرور دیکھتا۔ سب سے پہلی ندیا کے پار دیکھی۔ اس کی ہیروئن کامنی کوشل تھیں۔ دلیپ کمار کی وفات کے بعد اب، موبئی کی فلم انڈسٹری ویران ہو گئی ہے۔ شفیق سلیمی سے متعلق ان کے چھوٹے بھائی جلیل عالی کا مضمون محبتوں اور شفقتوں کا آئینہ ہے۔ بھائیوں کی آپس میں محبت کی تصویر نمائی نے اشکبار کر دیا۔ ان کے دو بڑے بھائی یکے بعد دیگرے منہ موڑ گئے۔ اس غم اور درد میں، میں جلیل عالی کا اور ان کے خاندان کا برابر کا شریک ہوں۔ جلیل عالی شاعری اور نثر میں خاصے دست و قلم ہیں۔ ان کی کتاب ”شعری دانش کی زمین میں“ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ ”بیاض“ کا گوشہ ادبی وقار و دانش سے بھرپور ہے۔ عقیدت نگاری ”دامنِ دل کشاں“ ہے۔ مضامین موثر و موقر افسانے رنگ آمیز، مائیکرو فکشن، حیرت انگیز ہیں اور شاعری کمال کی ’چیز‘ ہے۔ آپ نے رنگ رنگ کے شاعر جمع کر رکھے ہیں۔ غزلوں میں پسند کے اکا دکا شعر نکالنا میرے ایسے کم سخن فہمی والے کے لیے آزمائش کی گھڑی ہے۔ البتہ غلط فہمی کی بات الگ ہے۔ ہزارے کا ذکر ہوا ہے تو اتنا کہوں طالب انصاری اور ہارون الرشید کی ”بازیافت“ مبارک ہے۔ طالب انصاری رسالوں میں بالخصوص ”بیاض“ میں آتے تھے جانے کیوں چلے گئے تھے۔ ان کی رونق افروزی ان کے حویلیاں کے قیام کی یاد دلاتی ہے۔ وہ ایبٹ آباد کی ادبی محفلوں میں تو آتے رہتے تھے انھوں نے حویلیاں میں شعر و سخن کے میلے لگا رکھے تھے۔ ہارون الرشید احمد ندیم قاسمی (مرحوم) کے خاص بندے تھے۔ انھوں نے بالاکوٹ ٹھنڈی میٹھی ہواؤں سے صرف (ص رف) لے کر باغ و بہار شاعری کر رکھی ہے۔ ”پچی“ خالد احمد کا اختصاصی لہجہ ہے۔ جمیل یوسف صاحب نے میرا ایک شعر چنا۔ وہ بہت پیارے ہیں۔

اشرف کمال

محترم عمران منظور نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

حسب سابق خوبصورت سرورق کے ساتھ بیاض کا جولائی کا شمارہ ملا۔

پہلی فرصت میں فہرست پہ ایک نظر دوڑائی۔ مجموعی تاثر اچھا قائم ہوا۔ کہ پہلے کی طرح بیاض شعر و ادب کے حوالے سے خاصہ قیمتی ادبی سرمایہ لیے ہوئے ہے۔

شروع میں حمد و نعت کے گلدستے مہکتے ہوئے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ بقول

سرور حسین نقشبندی:

یہ کون ہم کو جگاتا ہے شب کے پچھلے پہر نفس نفس یہ صدائیں کہاں سے آتی ہیں

ابتدا میں جناب خالد احمد کی نظم ''وہبی'' صبح شام کی راہگزر سے ہوتی ہوئی گاؤں سے شہر اور دھوپ سے چھاؤں کا سفر کراتی ہے:

صبح سفر، شام سفر صبح کہیں، شام کہیں راہگزر، راہگزر

سید ریاض حسین زیدی نے نعت رسول ؐمقبول میں انسان کے رتبے کی بات کی ہے۔

جلیل عالی ویسے تو خوبصورت شعر کہتے ہیں مگر ان کی نثر بھی کمال کی ہوتی ہے۔ یہاں ایک مضمون ''بیاد باد، خلیق دکھائی دیا'' تو رہ نہ سکا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ جملے دیکھیے:

تعلیم کی خاطر گاؤں سے شہر کا سفر ایسے ہوتا تھا جیسے بیابان سے پرستان کا سفر۔ (کاش ہمیں بھی کوئی ایسا پرستان میسر آ سکتا!!!)

جلد ہی انھیں احمد ندیم قاسمی کے پاس لے گیا اور یوں وہ بھی فنونیے ہو گئے۔

اخلاقی جھجک خاندانی وراثت کے طور پر ہمارے خون میں شامل تھی۔

خالد احمد کے نعتیہ مجموعوں کے حوالے سے سیدہ آیت گیلانی کا مضمون بھی معلوماتی ہے۔

جلیل عالی کا شعر دیکھیے:

تو کیا خود سے مکرنے جا رہے ہو نشیبوں میں اترنے جا رہے ہو

خالد احمد کا شعر معانی کی کئی گرہوں میں لپٹا ہوا ہے۔

سورج ابھرے تو زمیں پر سے اٹھائے سائے روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

حامد یزدانی کی غزل بھرپور ہے:

عکس عکس پگھلا کر آئنے بناتے ہیں

مختصر جملوں میں بڑی بات کی ہے ہارون الرشید نے:

کوئی خواہش نہ ارمان رکھا مختصر اپنا سامان رکھا

حسب سابق غزلوں نظموں اور مضامین کا خوبصورت انتخاب کیا گیا ہے ۔ افسانوں، یادوں اور مائیکرو فکشن کا حصہ بھی جاندار ہے۔

حامد یزدانی اپنی نظم ایک چوکورسی شب میں، دھوپ سے حرف بناتے نظر آتے ہیں۔

رخشندہ نوید کی نظم کسی اور سے محبت کر، مجھ جیسے قاری کو آئنوں کے نئے حیرت کدوں میں لے جاتی ہے۔

ایک نشست میں اتنا ہی پڑھا جا سکتا ہے اور پڑھنے کے بعد لکھا جا سکتا ہے۔ المختصر پورا شمارہ خوبصورت ادب پاروں سے سجایا گیا ہے۔ تمام حصے اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے خوب ہیں۔ غزلوں، نظموں، کے علاوہ افسانے اور خاکے بھی ہمیں عصری ادب کی سمت سے آشنا کرتے ہیں۔

آفتاب احمد ملک

برادر ذی وقار عمران منظور جی

سلام نیاز مندانہ!!

امید ہے مزاج بخیر ہونگے۔

جریدہ ادب جولائی حج و عیدالاضحیٰ مبارک کے دیدہ زیب سرورق کے ساتھ بروقت مطالعے کی میز پر پہنچا۔ بے حد ممنون و متشکر ہوں۔ حسب روایت طے شدہ شیڈول بمطابق فہرست حمد، نعت، قطعات، تصوف، رفتگاں، افسانے، یادیں، مائیکرو فکشن، شاعر امروز، غزلیات و نظمیں، مستقل سفرنامہ کی اقساط شاہ داستان

(آیتی) مضامین طنز و مزاح، خاکے اور خطوط رجسٹرڈ صفحات 241 پر مشتمل ہیں۔ ہر ادبی مزاج کے حامل قاری کے لیے ماہانہ خوبصورت تحریروں کا مجموعہ جو تنہائی میں بآسانی چند گھنٹوں میں پیراشن ہضم ہو جاتا ہے۔ اور آئندہ نئے شمارے کی آمد تک ذائقہ برقرار رہتا ہے۔ پسندیدہ وصنعت و معیار وقت پر احباب کو بذریعہ ڈاک موصول ہو جاتا ہے۔ سول سوسائٹی کا قومی نام مجمل قابل صد تحسین ہے۔

خوبصورت و معلوماتی 'شاہ داستان' میں شاہ جی نے تھائی لینڈ میں اُتار دیا۔ بیان کا ہی کمال و جمال ہے اور مہاراجہ سکھ جی کے کمالات پڑھ کر سفرنامہ نگار سید بادشاہ کی نثری شاعری کی داد دی جاتی ہے۔ مستنصر تارڑ بھی لفظوں سے کھیلتا ہے۔ شوکت علی شاہ صاحب بھی قارئین کے لیے علمی، ادبی و تاریخی ڈائریکٹری ہیں۔ مثلاً یہ سطور دیکھیے گا۔

''جہاں پیچھے ان کا گردوارہ ماضی اور آگے روشن مستقبل۔ ماضی جوان کا اپنا تھا مستقبل جو دوسروں کے لیے وقف تھا۔ (صفحہ نمبر 170) کچھ پتہ نہیں چلتا کہ پی کون رہا ہے پلا کون رہا ہے ہنس کون رہا ہے ہنسا کون رہا ہے۔ ہر طرف قہقہوں کی نقرئی گھنٹیاں (صفحہ نمبر 177) انسان مٹی رہا ہے انسانیت دم توڑ رہی ہے۔

ممتاز شاعر، مورخ و نقاد ناصر ملک صاحب نے ڈاکٹر غافر شہزاد کے ناول 'مکلی میں مرگ' پر ناقدانہ رائے دی۔ مختصر و جامع تبصرہ حساس قارئین کو اپنے حصار میں مقید کر لیتا ہے۔ عامر رضوی نے شبہ طراز صاحبہ کی افسانوی صلاحیتوں کا تحریری احاطہ کیا ہے۔ راقم کا مضمون بعنوان 'صاحبزادہ تابش کمال کی دینی غیر منقوط نعتیہ شاعری' بھی شامل مضامین ہے۔

سیدہ آیت صاحبہ نے 'تشبیب' پر تفصیلی تبصرہ و مطالعہ جو خالد احمد کا نعتیہ مجموعہ ہے بڑی عمیق تحقیق کا غماز ہے۔ حمدیہ و نعتیہ گفتگو ہے۔ آواز لفظوں کے لبادے اوڑھتی ہے۔ ساری باتیں بیدی بھری (صفحہ نمبر 42)

72 غزل گو اور 14 نظم گو شعرا بھائیوں کا تازہ و حیران کن کلام کی اتنی تخلیقی قوت ہے کہ ایک ایک شعر پر کتاب تحریر کی جا سکتی ہے شاعری میں نئے الفاظ کی آمد پڑھ کر حیرت کدہ میں گم صم کے بھلا یہ الہامی کلام تو نہیں بڑھ رہے ہیں معذرت کے ساتھ چند ضرب المثل تازہ اشعار قند مکرر لکھنا چاہوں گا:

گوہر سخن کہاں ؟ تو کس کے لیے خالد
بحر سخن لہر لہر چھان رہا ہے
خالد احمد

سنانے کو بہت کچھ تھا مگر سنتا نہیں وہ
ہماری داستاں پوری کی پوری رہ گئی ہے
ہمارے گھر میں جس کے شور سے رونق تھی ثاقب
وہ طوطا اڑ گیا پنجرے میں چوری رہ گئی
آصف ثاقب

کیا ضروری ہے کیا نہیں ہے
کھولنا ہے تو وقت پر کھول
اعجاز کنور راجہ

میرے دل کے مندر میں
روز آتی جاتی رہو
شام ساتھ لایا کرو
اور دیے جلاتی رہو
جمیل یوسف

غم نہ کر تو خوشی بھی آئے گی
جیسے آتی ہے صبح رات کے بعد
راحت سرحدی

کچھ اور بھی الفاظ و معانی کے علاوہ
لکھنا تو بہت کچھ ہے کہانی کے علاوہ
صفدر صدیق رضی

اک نظر میں ہی مرشد کامل
بے ہنر کو کمال دیتے ہیں
رشید آفرین

لفظوں میں تیری بات اتاری نہیں گئی
کاغذ پہ تیرا عکس بنایا نہیں گیا
عقیل ربانی

ہم ہیں متلاشی سکوں کے آج کل
اور چاروں سمت ہے خوف و ہراس
اقبال سروبہ

آؤ کچھ کام ادھورے ہیں مکمل کر لیں
ختم یہ وقت کی مہلت بھی تو ہو سکتی ہے
ارشد محمود ارشد

اکثر پوچھتا پھرتا ہوں دیواروں سے
کون ہے مجرم شہروں کی رسوائی کا
انصر حسن

بڑھتی جاتی ہے یاد کی گٹھڑی
بوجھ شانوں کا کم نہیں ہوتا
شہزاد احمد شیخ

حرف مطلب غزل میں در آنا
آنکھ سے گر ادا نہیں ہوتا

بدلنا حرف سے ثاقب نہیں کچھ بھی رہا ممکن
زمانہ ساز بن کے اب اداکاری کریں گے ہم
ثاقب تبسم ثاقب

تبدیل جیسے کر لیے معنی لغات نے
ہر چیز ہو گئی کے پرانی بدل گئی
اکرم جاذب

ہم نے دیکھا نہیں پس منظر
زندگی ہے کتاب آئینہ
حکیم خان حکیم

دن کا مزدور محنتی سورج
شب کے اسرار سے نکل آیا
ساجد رضا خان

میں نے اک بار ترے غم کو دکھائیں آنکھیں
اب مرا عشق قلندر، نہیں ہونے والا
رفعت وحید

جو ہمارا ہے نقطہ آغاز
عام لوگوں کی آخری حد ہے
صغیر احمد صغیر

حصہ نظم میں دیگر نظم گو شعراء میں محترمہ درخشندہ نوید صاحبہ کی نظم "کسی اور سے محبت" صفحہ نمبر 225 کمال کی لفظیات واستعاروں کی ایک دنیا آباد ہے مثلاً:

میرے حیرت کدے میں پاؤں نہ رکھ
من کے ساگر کی اجلی موجوں میں
من کے ساگر کی سست موجوں کو
ایک گوہر میں ڈھلتے دیکھا ہے
آرزوؤں کے پار ٹیلوں پر
آس کا دیپ جلتے دیکھا ہے

خطوط نگار حقیقتاً اس معروف ومقبول جریدہ کے نقاد ہیں جو اپنی اصلاح کے ساتھ دیگر احباب کی خیر وعافیت کے علاوہ آراء وتجاویز بھی تحریر کرتے ہیں۔ محترم پاکستانی ادب کے معمار" آصف ثاقب نے اپنے مکتوب میں راقم کا ذکر خیر کیا۔ آفتاب نوازی کے لیے بصمیم قلب ممنون ہوں۔

طالب انصاری

مکرمی عمران منظور صاحب

بہت احترام اور مسنون سلام!

'بیاض' کا شمارہ بابت جولائی 2021 نظر نواز ہوا۔ عنایت و مہربانی

شفیق سلیمی صاحب کے حوالے سے جلیل عالی صاحب کا اپنی یادوں پر مشتمل مضمون بہت دل گداز اور رقت آمیز تھا۔ کڑوی کسیلی، خوشگوار، دکھ بھری اور مسرت آمیز یادیں ہی تو ماضی کہلاتی ہیں۔ یہ یادیں نہ ہوں تو ماضی نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے۔ ایک عام آدمی کے برعکس فن کار یادوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس لیے یہ حساس فن کار ماضی آفرین ہوا کرتا ہے۔ مضمون میں شفیق سلیمی صاحب کا ہجرت کے حوالے سے یہ شعر بہت پسند آیا:

مدت کے بعد آئے تو روٹھی ہوئی سی تھی
تختی ہمارے نام کی در پر لگی ہوئی

محترمہ درخشندہ نوید صاحبہ نے اپنی جوانی کی اور جدہ مشاعرہ پر مشتمل چند یادوں میں قارئین کو شریک کیا۔ انھوں نے کالج کے زمانے کی الہڑ یادوں کو جس ہنرمندانہ بے رُخی سے بیان کیا، وہ ایک منجھے ہوئے نثر نگار کا ہی خاصہ ہے۔ میں درخشندہ صاحبہ کی نثر سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ ادبی رسائل کے توسط سے غائبانہ تعارف بطور شاعرہ کے ہے۔ تاہم زیر نظر مضمون میں ان کی نثر بھی بہت مضبوط دکھائی پڑتی ہے۔

سلیمان عبداللہ ڈار صاحب متصوفانہ مضامین میں اپنے تبحر علمی سے ہم تشنہ کاموں کی پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک مفید اور ایمان افروز سلسلہ ہے تصوف ایک الگ دنیا ہے۔ اس سے اختلاف کے باوجود اس کی گیرائی اور انسانی زندگی پر اس کے مثبت اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ میری رائے تصوف کے حوالے سے مختلف ہے۔ ہر وقت اوراد و وظائف کیے جانا اسلام کا پیغام نہیں ہے۔ عبادت شعائر اسلامی ضرور ہے مگر یہ ایک جز ہے۔ کل نہیں ہے۔ سورہ مزمل میں اللہ تعالیٰ نبی کریم صلعم سے کہتا ہے کہ رات کو زیادہ عبادت نہ کیا کرو۔ اس میں کچھ تخفیف کرو یا اپنی مرضی سے کچھ بڑھا لو۔ دیکھو ہم تم پر ایک بھاری ذمہ داری عائد کرنے والے ہیں۔ یہ بھاری ذمہ داری کیا ہے؟ اس کی بہت سی توضیحات کی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ انقلابی ذمہ داری، جو کہ ہمارے پیغمبر کو سونپی گئی، کو نبھانے کے لیے تحرک بہت ضروری تھا۔ نبی کریم نے عرب کے جاہلانہ معاشرے میں جو انقلاب برپا کیا وہ مسلسل جد و جہد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ سورۃ احزاب میں نبی کریم کے اسوۂ کو مومنین کے لیے ایک مثال اور مشعل راہ قرار دیا گیا ہے اور ہمارے پیغمبرؐ نے تمام زندگی جد و جہد اور جانفشانی میں گزاری ہے۔ اسی طرز زندگی کا ہمیں اتباع کرنا چاہیے۔ ڈار صاحب نے اللہ کے رنگ میں رنگ جانے کی اپنی فکر کے مطابق تشریح کی ہے۔ اللہ کا رنگ کیا ہے؟ اس کی بھی توضیحات پیش کی جا سکتی ہیں۔ میرے نزدیک اللہ خالق ہے، یہ اس کا ایک رنگ ہے۔ اللہ کا یہ رنگ اختیار کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی میں سر کھپانا پڑے گا تا کہ انسانوں کے فائدے کے لیے کوئی نئی ایجاد کوئی نئی تخلیق لائی جا سکے۔ اور ہم اپنے خالق کی خلاقی کے رنگ میں رنگ جائیں۔

شاہد ماکلی صاحب نے مزید دو نوجوان شاعروں سے متعارف کروایا۔ نئے لکھنے والوں کے ہاں نیا اسلوب بہت لطف دیتا ہے۔ روایت کا اپنا مقام ہے، مگر نئے تجربے اور انھیں نئے انداز میں پیش کرنے سے تازہ کاری کا احساس، ادبی کیف و انبساط میں اضافے کا موجب ہوتا ہے۔ نئے لکھنے والے زبان کی درستی اور روایت کا خیال رکھیں گے تو راستہ مستقیم رہے گا۔ شاہد ماکلی نے فضل گیلانی اور مقداد احسن کے جن شعروں کا انتخاب کیا ہے، وہ اسی خصوصیت سے مملو ہیں۔ زبان بھی بامحاورہ ہے اور کہیں بھی جان بوجھ کر یا ضرورت کے تحت غیر مانوس الفاظ کو نہیں برتا گیا۔ اسی کو جدید لہجہ کہتے ہیں۔ ہر طرح کا رطب و یابس اکٹھا کر دینا جدیدیت کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

غزلیات کی تعداد میں زیادہ تھیں اور خوب تھیں افسانے بھی مناسب تھے۔ اس مرتبہ ایک نظم ارسال کر رہا ہوں۔ احباب بیاض کی خدمت میں سلام

رانا محمد شاہد

محترم جناب عمران منظور، جناب اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے سرورق پسند آیا۔ 'بیاض' کے سرورق کے پیچھے پس ورق کے پیچھے ادارے کو ملنے والی کتابوں کا تعارف کتاب کے ٹائٹل کی صورت شائع کیا جاتا ہے، جس سے ہمیں بہت سی نئی کتابیں (شاعری ونثر) سے آگاہی ملتی ہے۔ اس دفعہ ہمیں ارشد علی کی خودنوشت زمین زاد اور جمیل احمد عدیل کی بیتا ہوا مستقبل پہلی نظر میں اچھی لگیں۔ ریاض ندیم نیازی کے حمد ونعت اور عثمان قیصر کے غزلیات کے مجموعے کے ٹائٹل بھی اچھے تھے۔

تصوف کے حوالے سے سلیمان عبداللہ ڈار کی تحریر ''تیرے جلوے میرے سنگ سنگ'' خود پڑھتے ہوئے ابرارالحق کے گائے یہ جملے اشعار یاد آ گئے۔

''تیرے رنگ رنگ، تیرے رنگ رنگ، میں جہاں بھی جاؤں دنیا میں تیرے جلوے میرے سنگ سنگ''

خوش قسمت اور رب کے محبوب بندے ہوتے ہیں کو اپنی خواہشات بلکہ سب کچھ قربان کر کے خود پر رب کی محبت کا رنگ چڑھا لیتے ہیں۔

جلیل عالی نے اپنے بھائی شفیق سلیمی کی شفقت اور ان کی زندگی کے بہت سے دلچسپ پہلوؤں پر تحریر لکھی۔ ایسی خوبصورت تحریر ایک بھائی ہی لکھ سکتا ہے۔ جلیل صاحب کے موٹر سائیکل پر بیگم کو بھول جانے کے واقعہ نے خاصا محظوظ کیا۔ اسلام عظمی اور کلیم خارجی کے افسانے پسند آئے۔ حالات حاضرہ کے تناظر میں تہنیت رباب کا ''وینٹی لیٹر'' بھی زبردست رہا۔

رخشندہ نوید کی یادوں پر مشتمل تحریر ''یہ کہاں نصیب میرے.....'' کے ابتدائی جملے پڑھتے ہوئے والدہ یاد آ گئیں۔ موسم کی مناسبت سے پیٹیوں سے کپڑے، گدے، رضائیاں وغیرہ نکالنا اور پھر انھیں کھول کر کچھ دیر کے لیے، باہر رکھ دینا ان کا معمول تھا۔ سمن آباد کے تینوں گول چکروں سے گزر کر اودوڈائجسٹ کے دفتر جانا ہمارا بھی ایک عرصے تک معمول رہا۔ ان کی یادوں کا پہلا حصہ اچھا لگا۔

امید ہے کہ یہ سلسلہ قارئین کو بھی پسند آئے گا۔

مائیکرو فکشن میں ''میری امی ہیں'' اور ''مقدر'' اچھے لگے۔ رضا علی عابدی آپ بھی اردو زبان کے محسن ہیں کہ آج کی نسل کو اردو سے محبت کرنے اور محبت رکھنے والوں کے خطوط پڑھا رہے ہیں۔ مختلف ادیبوں اور ان کی کتابوں پر تبصرے بھی اچھے لگے۔

دعاگو

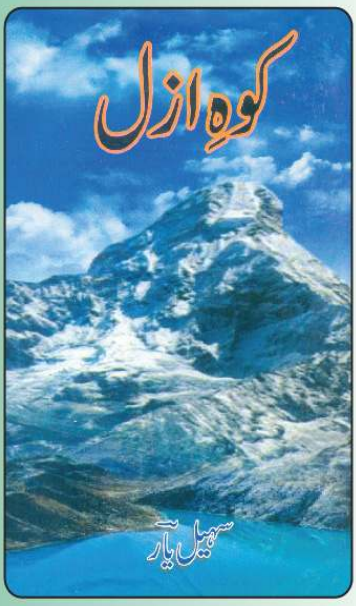
کوہِ ازل
سہیل یار

زاہد منیر عامر
لمحے کی روشنی

خیالات
قومی اخبارات میں شائع شدہ آرٹیکلز کا انتخاب
افتخار شوکت

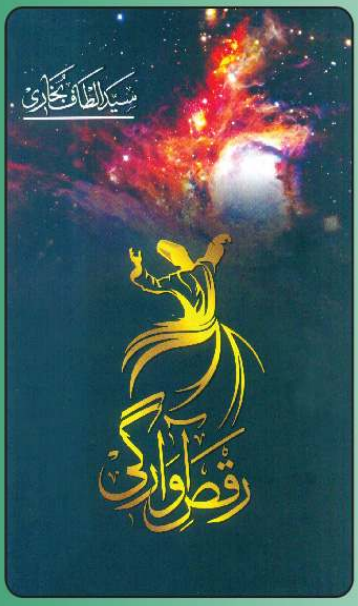
مسیر الطاف بخاری
رقصِ آوارگی

کُلّیاتِ نجیب احمد

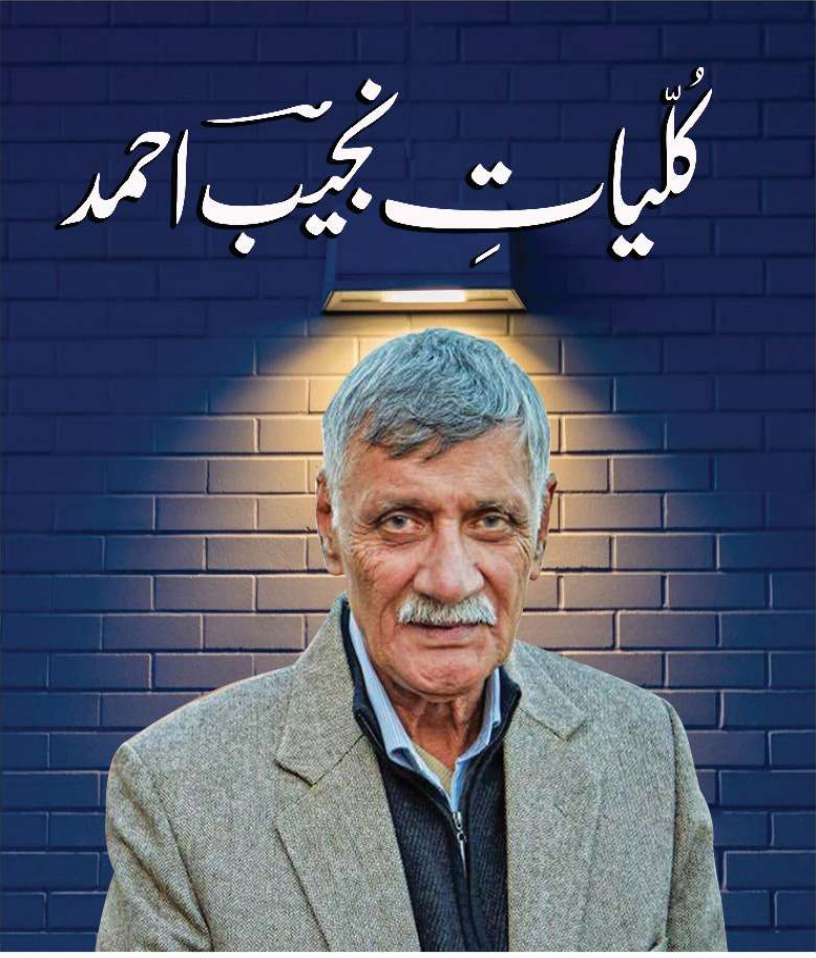

ترتیب وتدوین

نوید صادق